the Zoology is a difficult

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ

سرپرست

صاحبزادہ مرزا ناصر احمد ایم۔ اے (آکسن)

مدیران

عطاء المجیب راشد

شمشاد علی سید

اس شمارہ میں لکھنے والے

- صلاح الدین احمد
- پرویز پروازی
- مختار احمد
- امجد محمود نوشہری
- سلیم اختر صدیقی
- نعیم اختر صدیقی
- ہدایت اللہ ہادی
- محمد منظور صادق
- سعید انجم
- ابن قاضی

جلد ۱۳ — اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۳ء — شمارہ ۲

(ضیاء الاسلام پریس میں چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے شائع کیا۔)

"کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ"

لاریب اللہ تعالیٰ کی ذات ہی قائم بالذات اور حیّ وقیوم ذات ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔ باقی سب نے ایک دن اس کے حضور حاضر ہونا ہے۔ موت سے کسی ذی روح کو مفر نہیں لیکن بعض مقدس وجودوں کی جدائی اس حد تک اندوہناک ہوتی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان کی یاد تازہ تر ہوتی جاتی ہے۔ فرقت کا غم بڑھتا جاتا ہے۔ اگرچہ خدا تعالیٰ کی ازلی تقدیر نافذ ہو چکی ہے اور خدا تعالیٰ کا محبوب اپنے فرائض منصبی بطریق احسن ادا کرنے کے بعد بتکمیل مرام اپنے رب کے حضور حاضر ہو چکا ہے لیکن دل ہیں کہ ان کو اس عظیم محسن کی وفات تسلیم کرنے میں ابھی تک تامل ہے حقیقت بہرحال حقیقت ہے جسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت قمر الانبیاء صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ۲ ستمبر ۱۹۶۳ء کی شام لاہور میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خدائی فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم ہے لیکن ہمارے دل وفورِ غم سے ڈوبے جاتے ہیں۔ حضرت میاں صاحب مرحوم کی ذات گرامی جماعت کے لئے ایک عظیم سہارا اور مرکزی ثقل کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ حضرت بانی جماعت احمدیہ علیہ السلام کے نامور فرزند، عظیم الشان خدائی نشانات کے مظہر اور مقدس بزرگ تھے۔ آپ صاحب کشف والہام تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین اور خالق کائنات کے ساتھ سچے عشق کا بے پناہ جذبہ آپ کے اوصاف حمیدہ میں سرفہرست تھا۔ اسلام، بانیٔ اسلامؐ اور قرآن حکیم کے ساتھ بے پایاں محبت آپ کے اخلاق کا طرۂ امتیاز تھی۔ دینی غیرت وحمیت کا پاکیزہ جذبہ آپ کے وجود باجود میں اس قدر رچا ہوا تھا کہ جہاں کہیں اسلام کی عزت وناموس پر کسی شقی القلب نے تازیانہ حملہ کیا اسلام کا یہ بطل جلیل فوراً اسلام کے دفاع کیلئے سینہ سپر ہو گیا اور اپنی خداداد جلالی شان اور اپنے رعب ووقار کے ساتھ ایسا محکم اور مدلل جواب دیا کہ دشمن لاجواب ہو کر رہ گیا۔ جس تحریر آپ کے کردار کا ایک اہم پہلو ہے جو آپ کو اپنے والد ماجد حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے ورثہ میں ملا۔ بلاشبہ آپ حضرت "سلطان القلم" علیہ السلام کے نامور صاحب قلم فرزند تھے۔ آپ کی گرانقدر علمی تصانیف اور قلمی خدمات تاریخ احمدیت کا ایک سنہری باب ہیں اور رشد وہدایت اور جلائے ذہنی کا ایک لازوال خزانہ!۔ جماعت کا کوئی فرد بھی آپکی ہمدردی سے محروم نہ تھا لیکن کالج کے طلباء کے ساتھ آپ کا سلوک خاص مشفقانہ رنگ کا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں آپ نے کالج کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے جو گرانقدر خدمات سرانجام دیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

ہم اراکین ادارۃ المنار اس سانحہ جانکاہ پر سیدنا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ، حضرت میاں صاحبؓ کے اہل خانہ، آپ کے بچوں، دیگر افراد خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور احباب جماعت سے دلی تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت میاں صاحبؓ کے درجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں اپنے خاص مقام قرب سے نوازے۔ آمین یا ارحم الراحمین۔

(ع۔م۔ا)

اداریہ

سخنہائے گفتنی

دانش گاہ پنجاب کے سربراہ کی حیثیت سے پروفیسر حمید احمد خاں صاحب بالقابہ کا تقرر ہمارے نزدیک، مسائلِ رواں کی سب سے اہم اور خوش کن خبر ہے — ہم تہ دل سے پروفیسر موصوف کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اللہ ان کے وجود کو دانشگاہ پنجاب کے لئے مفید ترین بنائے اور اس تقرر کے جلو میں آنے والی گوناگوں اور متنوع ذمہ داریوں بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین

ہمیں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی ذاتِ گرامی سے اور انہیں تعلیم الاسلام کالج سے جو انس ہے وہ محتاجِ بیان نہیں — اس لئے ہم بجا طور پر ان کی ذاتِ ستودہ صفات سے چند توقعات وابستہ رکھتے ہیں — ہماری خواہش ہے کہ جہاں وہ دانشگاہ پنجاب کی انتظامی الجھنوں کو دُور کرنے کی سعی فرمائیں وہاں وہ وسیع تر قومی مفاد کے پیشِ نظر اپنی قومی زبان کو اس کا جائز مقام دلانے کی کوشش میں بھی مصروف رہیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ قومی زبان کا یہ پرستار اپنے مرتبہ اور مقام کے لحاظ سے اُردو کی بیش از بیش خدمات سرانجام دینے کے لئے ہر دم مستعد رہے گا! اور اُردو کی محبت اُن کے دل سے محو نہیں ہو گی۔!

دانش گاہِ کراچی کا فیصلہ کردہ اُردو کو اعلیٰ درجوں تک بھی ذریعۂ تعلیم جاری ہے، ہر لحاظ سے قابلِ تحسین و ستائش اور لائقِ تقلید ہے۔ ہم پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی خدمتِ عالیہ میں گزارش کرتے ہیں کہ وہ بھی جرأتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے اپنے آہنی عزم کا مظاہرہ فرمائیں اور یہ انقلابی فیصلہ کر گزریں۔ ہم توثق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا یہ اقدام قوم پرست حلقوں میں بنگاہِ تحسین دیکھا جائے گا اور ان کا نام اُردو کے پرستاروں میں سرِ فہرست ہو گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

اس ضمن میں ایک حقیر سی تجویز یہ ہے کہ اگر فی الوقت یہ ممکن نہ ہو تو اُردو کو کم از کم بی۔ اے کے معیار تک ایک لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے — اگر بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کی طرح بی۔ اے کے کورس میں اختیاری (OPTICNAL) مضمون کی جگہ اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت دے دی جائے تو ہمارا خیال ہے کہ یہ امر چنداں مشکل نہ ہو گا۔!

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے وجود کو دانش گاہِ پنجاب اور ملک و ملت کی اعلیٰ ترین خدمات کی توفیق بخشے۔

ع

ایں دعا از من و از خلقِ خدا آمین باد !

(پ۔پ)

ہم اور آپ

المنار کا تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے ـــــ ہم نے اپنی سی پوری کوشش کی ہے کہ اسے آپ کے لئے زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنائیں ـــــ ہم اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ آپ فرمائیں گے۔!

المنار اس لحاظ سے نئے دور میں داخل ہوا ہے کہ مدیران نئے ہیں اور غالباً مواد بھی آپ کے لئے نیا ہوگا! آپ کے مضامین سے ترتیب دیا ہوا رسالہ ہے اور آپ کے مضامین سے ہی آئندہ ترتیب دیا جائے گا! اس کا معیاری ہونا آپ کی دلچسپی پر منحصر ہے اس لئے ہم نیک خواہشات سے آپ کی خدمت میں یہی درخواست کرتے ہیں کہ ؎

نیا سفر ہے، نئی منزلیں، نئی راہیں ؎ نئے چراغ جلاؤ نئے سفر کے لئے!

آیئے ہم اس رسالہ کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی سعی کرنے کا عہد کریں! امید ہے آپ ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون فرمائینگے ـــــ آپ کے تعاون کا مطلب ہماری کامیابی اور ہماری کامیابی کا مطلب معیاری رسالہ ہے!

اس شمارہ میں جو مقالات شامل کئے جا رہے ہیں وہ آپ ہی کے بعض ساتھیوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ آپ بھی قلم اٹھائیے، آپ بھی ایسے مقالات لکھ سکتے ہیں یہ کوئی مشکل کام نہیں فقط عزم کرنے کی بات ہے۔ محمد منظور صادق صاحب حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ کے بارہ میں اپنے تاثرات پیش کر رہے ہیں ـــــ دیکھئے ہم سب کے دل کی آواز ہے نا! نعیم اختر صدیقی صاحب گیارھویں کے طالبعلم ہیں، غالب کی نثر کے بارہ میں ان کا مقالہ بڑا خیال افروز اور قابلِ قدر ہے ـــــ سعید انجم صاحب سعادت حسن منٹو کے بارہ میں کچھ کہہ رہے ہیں اور ہدایت اللہ ہادی صاحب خواجہ حیدر علی آتش صاحب کو لے آتے ہیں! استقبال کیجئے نا ان کا ـــــ آپ کے جانے پہچانے ہیں دونوں! اگر نہیں تو اب سے تعارف پیدا کر لیجئے! ـــــ کالج کے قدیم طلباء میں سے سلیم اختر صدیقی صاحب اور امجد محمود نوشہروی صاحب شریکِ محفل ہیں ـــــ صدیقی صاحب اقتصادی مسائل کے بارہ میں خامہ فرسائی فرما رہے ہیں اور امجد صاحب "خونِ جگر ہونے تک" کے بارہ میں!! 'خونِ جگر ہونے تک' فضل احمد کریم فضلی کا مشہور ناول ہے! کیا آپ نے پڑھا ہے؟ اگر نہیں تو اس مضمون کی روشنی میں اسے پڑھئے! افسانوں اور ہلکے پھلکے مضامین کا حصہ بھی دیکھئے "طاہر قاضی صاحب کے شادی کے نام خط" کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ مختار احمد صاحب کا افسانہ بھی شاملِ اشاعت ہے۔ نظموں کا حصہ کچھ "لاغر" ہے اور ہمیں اس ناتوانی پر کوئی افسوس نہیں کیونکہ عطائے تو بہ لقائے تو ـــــ جو کچھ قابلِ اشاعت تھا وہ ہم نے شائع کر دیا اور جو بہت سی غزلیں بھی آپ نے بھجوائی تھیں وہ قابلِ اشاعت نہ تھیں! اب ہمارا کیا قصور؟ توجہ فرمائیے نا اس طرف!!

ہمیں آپ سے بہت سی توقعات ہیں۔ ہمیں مایوس نہ فرمائیے! لکھنے کی کوشش کیجئے! پھر کوشش کیجئے!! اور پھر کوشش کیجئے!!!

ہمیں آپ کے چہروں پر مستقبل کی روشنی درخشاں نظر آتی ہے ـــــ یاد رکھیں ؏

تمہیں ہو گے فروغِ بزمِ امکاں، ہم نہیں ہوں گے!

(مدیران)

قال اللہ تعالیٰ وقال الرسولؐ

صحبتِ صالحین

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے :۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ○ (توبہ : ۱۱۹)

ترجمہ :۔ اے ایمان والو! جو ایمان لائے ہو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

پھر ایک اور جگہ فرمایا :۔

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰىهُ وَکَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ○ (کہف : ۲۹)

ترجمہ :۔ اور تو اپنے آپ کو ان (خدا رسیدہ) لوگوں کے ساتھ (لگائے) رکھ جو اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صبح اور شام (غرض ہر وقت) اس کے آستانہ پر جھکے رہتے ہیں۔ اور تیری آنکھ ورلی زندگی کی زینت کے حصول کی خاطر ان (کو نظر انداز اور حقیر جانتے ہوئے) ان سے آگے نہ گزر جائے۔ اور تو ایسے شخص کی پیروی نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے جو اپنی بُری خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور جس کا معاملہ حد سے تجاوز کر چکا ہے

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحبتِ صالحین اختیار کرنے کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ اچھے ساتھی کی خوبیوں اور بُرے ساتھی کی خرابیوں کی مثال بیان فرماتے ہوئے حضورؐ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا :۔

اِنَّمَا مَثَلُ جَلِیْسِ الصَّالِحِ وَجَلِیْسِ السَّوْءِ کَحَامِلِ الْمِسْکِ وَنَافِخِ الْکِیْرِ فَحَامِلُ الْمِسْکِ اِمَّا اَنْ یُّحْذِیَکَ وَاِمَّا اَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِیْحًا طَیِّبَۃً، وَنَافِخُ الْکِیْرِ اِمَّا اَنْ یُّحْرِقَ ثِیَابَکَ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِیْحًا مُّنْتِنَۃً۔ (ریاض الصالحین)

یعنی اچھے اور بُرے ساتھی کی مثال خوشبو رکھنے والے اور بھٹی جھونکنے والے کی مانند ہے۔ خوشبو رکھنے والا تجھے اس میں سے کچھ دیدیگا یا تو اس میں سے کچھ خرید لیگا ورنہ تو اس کی اچھی خوشبو ہی پائے گا اور بھٹی جھونکنے والا یا تو تیرے کپڑے جلا دیگا اور یا تو اس سے بدبو دار ہوا پائے گا۔

امید ہے کہ طلباء ان ارشادات باری تعالیٰ اور فرمودات نبوی کی روشنی میں نیک اور شریف دوستوں کی رفاقت حاصل کرنیکی کوشش کریں گے۔
(ع۔ ھ۔ س)

تبرکات

ہمارا پیارا خدا

(کلمات طیبات سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام)

"اے سُننے والو سُنو کہ خدا تم سے کیا چاہتا ہے۔ بس یہی کہ تم اُسی کے ہو جاؤ۔ اُس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرو۔ نہ آسمان میں نہ زمین میں۔ ہمارا خدا وہ خدا ہے جو اَب بھی زندہ ہے جیسا کہ پہلے زندہ تھا۔ اور اب بھی وہ بولتا ہے جیسا کہ وہ پہلے بولتا تھا۔ اور اب بھی وہ سُنتا ہے جیسا کہ پہلے سُنتا تھا۔ یہ خیال خام ہے کہ اِس زمانہ میں وہ سُنتا تو ہے مگر بولتا نہیں۔ بلکہ وہ سُنتا ہے اور بولتا بھی ہے۔ اس کی تمام صفات ازلی ابدی ہیں۔ کوئی صفت بھی معطل نہیں اور نہ کبھی ہوگی۔ وہ وہی واحد لاشریک ہے جس کا کوئی بیٹا نہیں اور جس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور وہ وہی بے مثل ہے جس کا کوئی ثانی نہیں اور جس کی طرح کوئی فرد کسی خاص صفت سے مخصوص نہیں۔ اور جس کا کوئی ہمتا نہیں۔ جس کا کوئی ہم صفات نہیں۔ اور جس کی کوئی طاقت کم نہیں۔ وہ قریب ہے باوجود دُور ہونے کے۔ اور دُور ہے باوجود قریب ہونے کے۔ وہ تمثل کے طور پر اہلِ کشف پر اپنے تئیں ظاہر کر سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے نہ کوئی جسم ہے اور نہ کوئی شکل ہے۔ اور وہ سب سے اُوپر ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ اس کے نیچے کوئی اَور بھی ہے۔ اور وہ عرش پر ہے مگر نہیں کہہ سکتے کہ زمین پر نہیں۔ وہ مجمع ہے تمام صفاتِ کاملہ کا۔ اور مظہر ہے تمام محامدِ حقّہ کا۔ اور سرچشمہ ہے تمام خوبیوں کا۔ اور جامع ہے تمام طاقتوں کا۔ اور مبداء ہے تمام فیضوں کا۔ اور مرجع ہے ہر ایک شے کا۔ اور مالک ہے ہر ایک ملک کا۔ اور متصف ہے ہر ایک کمال سے۔ اور منزہ ہے ہر ایک عیب اور ضعف سے۔ اور مخصوص ہے اِس امر میں کہ زمین والے اور آسمان والے اسی کی عبادت کریں۔"

(کشتی نوح)

تبرّکات

حضرت مرزا بشیر احمدؓ آج ہم میں نہیں لیکن ان کی غیر فانی تحریریں آج بھی ہمارے دل و دماغ میں یک گونہ تابندگی پیدا کرنے کے لئے موجود ہیں۔ ذیل میں ان کے مبارک قلم سے نکلا ہوا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جو اُن کی سحر بیانی اور جادو نگاری کا آئینہ دار ہے ـــــ یہ تحریر حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کی وفات اور خلافتِ ثانیہ کے آغاز کے بارہ میں لکھی گئی ـــــ

"اے جانے والے! تجھے تیرا پاک عہدِ خلافت مبارک ہو کہ تُو نے اپنے امام و متاع مسیح کی امانت کو خوب نبھایا اور خلافت کی بُنیادوں کو ایسی آہنی سلاخوں سے باندھ دیا کہ پھر کوئی طاقت اسے اپنی جگہ سے ہلا نہ سکی۔ جا۔ اور اپنے آقا کے ہاتھوں سے مبارکباد کا تحفہ لے اور رضوانِ یار کا ہار پہن کر جنّت میں ابدی بسیرا کر۔ اور اے آنے والے! تجھے بھی مبارک ہو کہ تُو نے سیاہ بادلوں کی دل ہلا دینے والی گرجوں میں مسندِ خلافت پر قدم رکھا اور قدم رکھتے ہی رحمت کی بارشیں برسا دیں۔ تُو ہزاروں کانپتے ہوئے دلوں میں سے ہو کر تختِ امامت کی طرف آیا اور پھر صرف ایک ہاتھ کی جنبش سے ان تھرّاتے ہوئے سینوں کو سکینت بخش دی۔ آ۔ اور ایک شکور جماعت کی ہزاروں دعاؤں اور تمنّاؤں کے ساتھ ان کی سرداری کے تاج کو قبول کر۔ تُو ہمارے پہلو سے اُٹھا ہے مگر بہت دُور سے آیا ہے۔ آ۔ اور ایک قریب رہنے والے کی محبّت اور دُور سے آنے والے کے اکرام کا نظارہ دیکھ۔

اے فخرِ رسل قربِ تو معلوم شد
دیر آمدۂ زراہِ دُور آمدۂ"

(سلسلہ احمدیہ صفحہ ۳۲۴)

محمد منظور صادق
بی۔ اے سال اوّل

جانیوالے کبھی نہیں آتے ؛ جانیوالوں کی یاد آتی ہے

چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہونے والا تھا لیکن کائنات اُداسی کی ایک کثیف چادر میں لپٹی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی! یہی چاند جو کبھی خوشیوں کی بہاریں اپنے ساتھ لاتا تھا ـــــ آج اس کی روشنی میں تمام دنیا کے لئے ایک جگر پاش پیغام مضمر تھا۔ ہاں یہ چاند اس زمین پر بسنے والے اپنے جیسے ایک اور چاند کے لئے خدائے قادر و قیوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا پیغام لے کر آیا تھا۔ جونہی آسمان کا چاند طلوع ہوا ـــــ زمین کا چاند غروب ہو گیا!

یہ واقعہ ہے اُس شام کا جبکہ قمر الانبیاء حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ عین طلوعِ بدر کے وقت اِس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ ہاں! یہ واقعہ ہے اُس شام کا جبکہ نبیوں کا یہ پیارا چاند اس دنیا کو سوگوار بنا کر اپنے خدا کی آواز پر لبیک کہتا ہوا اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ یہ چاند خدا تعالیٰ کو کس قدر محبوب تھا کہ جس نے اس کے بلاوے کے لئے ایک طرف تو ماہِ کامل کو بھیجا اور دوسری طرف مہرِ منوّر کو اس کا ہمرکاب کیا۔ اور اِس طرح سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہی "نبیوں کا یہ چاند" اپنے روحانی سورج اور اِس زمانے کے بدرِ کامل کی محفل میں جا شریک ہوا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

۲ ستمبر کا یہ اندوہناک واقعہ اب بھی یاد ہے اور ہماری آنکھیں اب بھی لہو روتی ہیں۔ اگر ایک طرف زمین پر بسنے والی مخلوق، ہاں وہ مخلوق جو اِس چاند سے روحانی نور اور بصیرت حاصل کرتی تھی بے چین و بے قرار، غموں سے نڈھال، سر بگریباں اور اشک ریز تھی تو دوسری طرف آسمان بھی ماتمی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ اُس کے لئے بھی اِس غم کو جھیل جانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ بارش کی صورت میں آسمانی آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ زمین پر بسنے والوں کی دردناک آہوں نے آسمان کو بھی رُلا دیا۔ ع

کون روتا ہے کہ جس سے آسماں بھی رو پڑا

کس کو یقین آتا تھا کہ یہ پیارا چاند اِس قدر تیزی سے اپنی گردش ختم کر کے ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جائے گا۔ کانوں نے خبر سُنی تو جھوٹ جانا اور دل اب بھی باور کرنے کو تیار نہیں! ـــــ حالانکہ ایک ماہ سے بھی زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔ آپ کا نورانی چہرہ اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہاں! اب بھی وہ چاند اپنے پورے جمال کے ساتھ

کبھی جلسہ سالانہ کے سٹیج پر، کبھی مشاورت کی کرسیٔ صدارت پر، کبھی خدام الاحمدیہ اور انصار اللہ کے پنڈال میں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے پیغامات پڑھتا ہوا، مسجد مبارک کے وسیع صحن میں چہل قدمی کرتا ہوا، دکھی اور رنجور دلوں کو تسکین اور تسلی دیتا ہوا آنکھوں میں پھر رہا ہے! آہ! وہ حسین چہرہ آج تک آنکھوں کے سامنے ہے اور شاید ہی کبھی اوجھل ہو سکے ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے ؛ جانے والوں کی یاد آتی ہے

وہ عظیم ہستی، عظیم تر اوصاف و کمالات کی جامع تھی ـــــ کہ شمار کرنے بیٹھوں تو شمار نہ کر سکوں۔ چند ایک خصوصیات زینتِ قرطاس کرتا ہوں۔

سب سے زیادہ متاثر کرنے اور دلوں کو موہ لینے والی چیز آپ کا چہرۂ مبارک تھا۔ جس میں چاند جیسی خوبصورتی، لطافت اور ٹھنڈک تھی۔ چہرہ متبسم اور بڑا پُروقار، آنکھیں نیچی مگر نگاہیں دُور رس! وہ حسن کہ الفاظ میں طاقت کہاں کہ اظہار کی جرأت کر سکیں!!

دوسری بڑی خصوصیت جو خاص طور پر آپ کی ذاتِ بابرکات سے وابستہ تھی وہ آپ کی منکسر المزاجی اور غریب پروری تھی۔ آپ ہر اعلیٰ ادنیٰ اور غریب و امیر سے نہایت خوش خلقی، محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ مَیں نے کئی دفعہ آپ کو چھوٹے چھوٹے بچوں سے مصروفِ گفتگو پایا۔ اور اِس حال میں کلام کرتے ہوئے دیکھا کہ جس طرح ایک مہربان باپ اپنے عزیز بچوں سے کرتا ہے۔ آپ سے جو بھی ملتا ایک قسم کا روحانی سرور حاصل کرتا اور سمجھتا کہ آج اُس جیسا خوش بخت شاید ہی کوئی ہو ؎

آپ جن کے قریب ہوتے ہیں ؛ وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

آپ کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا رہتا تھا۔ جب بھی کوئی حاضر ہوا آپ کو ملنے کے لئے تیار پایا۔ اور اِس طرح ہر ایک کو اپنے فیض سے بہرہ مند فرماتے۔ مجھے جب بھی آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تو کئی دن تک اس سعادت پر فخر کرتا۔ کیوں نہ فخر کرتا؟ ؎

مجھ سے ملنا پھر آپ کا ملنا ؛ آپ کس کو نصیب ہوتے ہیں

تیسرے آپ کا اندازِ بیان!! ـــ آپ نے یہ ملکہ واقعی "حضرت سلطان القلم" سے ورثہ میں حاصل کیا تھا۔ جب بھی کسی موقعہ پر خطاب فرماتے تو سامعین جھوم اُٹھتے اور اس قدر منہمک ہو جاتے کہ دنیا و مافیہا کی خبر تک نہ رہتی۔ آپ کی تحریر روحوں کو فرحت اور سرور بخشتی تھی۔ جلسہ سالانہ پر آپ کی "ذکرِ حبیب" پر تقاریر کے الفاظ اب بھی کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آپ کا مخصوص اندازِ بیان جسم کے رگ و ریشہ میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ آپ کی تحریرات ہر زمانہ میں اہلِ علم اور اہلِ قلم کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں گی۔

چوتھے توکّل !! ـــــ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ کئے گئے خدائی وعدوں کے پُورا ہونے کا حق الیقین تھا۔ ایک دفعہ خاکسار نے گاؤں میں شدید مخالفت کا ذکر کر کے دعا کی درخواست کی۔ کافی تسلّی دینے کے بعد اور مختلف واقعات بیان فرما کر فرمایا "مخالفت کھاد کا کام دیتی ہے۔ کھاد بظاہر کس قدر بدبودار اور ناپاک ہوتی ہے مگر جب کھیت میں ڈالی جائے تو فصل کس قدر عمدہ ہوتی ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے کہ مخالفت ہو رہی ہے بلکہ ثابت قدمی اور احسن طریقہ سے ان کا مقابلہ کریں۔ جو لوگ آج آپ کے دشمن ہیں وہ کل آپ کے ساتھ شامل ہونگے"۔ چنانچہ اس کے چند دن بعد ہی حالات نے کچھ اِس طرح پلٹا کھایا کہ وہ دشمن جو جماعت کو ختم کرنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے خود ہی معافی مانگتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور اس کے بعد پھر کبھی کھُلے بندوں مخالفت کی جرأت نہ کی۔

توکّل علی اللہ کی دوسری مثال روس کے وزیر اعظم مسٹر خروشچیف کے اُس دعویٰ کا جواب ہے کہ "میں اشتراکیت کو اپنی زندگی میں ہی غالب دیکھنا چاہتا ہوں"۔ ایک طرف تو دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا ایک سربراہ اشتراکیت کے غلبہ کی خواہش کرتا ہے اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر اُسے اس کا پورا یقین ہے۔ لیکن دوسری طرف خدا تعالیٰ کا یہ درویش انسان ربوہ کی ایک چھوٹی سی بستی سے اس کا جواب دیتا ہے کہ مسٹر خروشچیف کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی اور پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریرات اور پیشگوئیوں کی روشنی میں اُس پر یہ بات واضح کر دی جاتی ہے کہ آخر اسلام ہی غالب ہوگا اور اشتراکیت مغلوب۔ اللہ۔ اللہ! کس قدر یقین تھا خدا تعالیٰ کے وعدوں پر جو اُس نے اپنے مسیح پاک سے کئے کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا جواب خدا تعالیٰ کا ایک گوشہ نشین مجاہد کس شان سے دے رہا ہے ـــــ اندازہ فرمائیے کہ کتنا یقین اور توکّل ہے !! وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

وہ ہم سے رخصت ہو گئے لیکن ان کی یاد اب بھی دلوں میں زندہ ہے اور زندہ رہے گی ؎

اس نے سب کو بُھلا دیا دل سے
اس کو دل سے بُھلائیگا اب کون؟

● ۔ "جس نے کچھ پایا محنت اور خدمت سے ہی پایا"۔

(خواجہ معین الدین چشتیؒ)

● ۔ "سب سے بُری طاقت وہ ہے جس سے انسان کے اندر تکبّر اور غرور پیدا ہو"۔

(ابن عطّارؒ)

مقالات

- صلاح الدین احمد
- امجد محمود نوشہروی
- سلیم اختر صدیقی
- نعیم اختر صدیقی
- ہدایت اللہ ہادی
- سعید انجم

اے آمدنت.....

۹ر جون ۱۹۶۳ء کو تعلیم الاسلام کالج کا سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد انعقاد پذیر ہوئے۔ ادیب بزرگ مولانا صلاح الدین احمد مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل تعلیم الاسلام کالج نے ان کو خوش آمدید کہتے ہوئے فرمایا:۔

"ہمارے آج کے معزز مہمان جناب مولانا صلاح الدین احمد کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اپنی ذاتی صلاحیتوں اور عدیم المثال خدمات کے باعث آپ ملک کے علمی، ادبی اور اصلاحی حلقوں میں ہمہ گیر شہرت اور عزّت کے مالک ہیں۔ آپ کی یہ خدمات عظیم بھی ہیں اور اہم بھی۔ آپ کی پُرکشش شخصیت اور صدقِ نیت کے دوست دشمن سبھی مدّاح ہیں۔ مولانا ایک عظیم ادیب ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی ہیں۔ آپ ایک فرد ہی نہیں ادارہ ہیں۔ آپ صرف "ادبی دنیا" ہی کے نہیں بلکہ دیگر ادب کے بھی سربراہ ہیں۔ آپ کی ادبی تخلیقات شہرتِ عام اور بقائے دوام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ یہ امر ہمارے لئے تشکّر و امتنان اور فخر کا باعث ہے کہ ہمارا اور مولانا کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور مولانا کی کرم فرمائی نے تعلیم الاسلام کالج کو ہمیشہ ایک متاعِ عزیز کی حیثیت سے نوازا ہے۔ آپ اپنی علالتِ طبع اور متنوّع مصروفیات کے باوصف بنفسِ نفیس کالج میں تشریف لاکر ہماری علمی و ادبی سرگرمیوں میں شمولیت فرماتے رہے ہیں۔ مولانا ایک بے غرض، مخلص، بے باک، روشن دماغ اور غیور پیرِ جواں ہمت ہیں۔ آپ ادبِ عالیہ کی عظیم ترین روایات کے حامل اور علمبردار، خود ایک صاحبِ طرز ادیب، نثر نگار اور نقّاد اور زبانِ اُردو کے قدیم خادم اور شیدائی ہیں۔ قوم کے ادبی و فکری مزاج کی تہذیب و تزئین میں مولانا نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں اور کیسوئے اردو کو جو کئی لحاظ سے اب تک منّت پذیرِ شانہ تھے جس ریاضت، انہماک اور محبت سے سنوارا ہے قوم اگر آج نہیں تو کل انہیں ضرور پہچانے گی۔ اور اس داستانِ عظیم کی جس میں مولانا قدم قدم پر ایک ہیرو کا کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ایک قومی دستاویز کی حیثیت سے دل سے قدر کرے گی۔ علمی و ادبی کساد بازاری اور قحط الرجال کے اس دور میں آپ کا وجود بسا غنیمت ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ دیر تک ہمارے درمیان زندہ و سلامت رکھے۔ ہم ممنون ہیں کہ آپ نے جلسۂ تقسیم اسناد کی تقریب میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شمولیت فرما کر ہماری عزّت افزائی فرمائی ہے۔ فجزاکم اللہ احسن الجزاء۔ ہم آپ کو صدقِ دل سے خوش آمدید کہتے ہیں"+

.... اجازتِ رخصت

مولینا صلاح الدین احمد نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اُس کا مکمل متن درج ذیل ہے :-

جنابِ استاذِ کبیر، اساتذہ کرام، حضراتِ محترم و عزیزانِ گرامی!

جادۂ حیات کا یہ مسافر اپنے سفر کے آخری مراحل طے کرتا ہُوا اِس نخلستانِ معرفت میں حاضر ہُوا ہے اور ابھی اُس کی آنکھیں اِس کی شادابیوں سے طراوت کے حصول میں محو اور اُس کی رُوح اِس کی نسیمِ جاں نواز کے جھونکوں سے فرحاں ہونے کی اوّلین کوششوں میں مصروف تھی کہ باغبان نے اس کے شانوں پر احسان و مروّت کے بہت بڑے بڑے بوجھ رکھ دیئے اور اُس کی ناتوانیوں کا قطعاً کوئی خیال نہیں فرمایا ــــــ کیوں صاحب! کیا آپ کے ہاں تھکے ہارے مسافروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے؟

مَیں جنابِ والا سے نہایت عاجزی کے ساتھ یہ التجا کرتا ہوں کہ مَیں واقعی اُس لطفِ کریمانہ کا بار نہیں اُٹھا سکتا جو آپ نے آج صبح میرے لئے تجویز فرمایا ہے۔ ازراہِ ترحّم مجھے اِس سے سبکدوش فرمایئے تاکہ مَیں اطمینان کا سانس لے کر اپنے دل کی چند باتیں اِس انجمنِ حکمت و معرفت اور اِس محفلِ خلوص و محبّت میں یک گونہ احساسِ فراغت سے کہہ سکوں۔

عزیزانِ گرامی! آپ نے خوش بختی سے زندگی میں داخل ہونے کا وہ زمانہ پایا ہے جب عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔ انسان اپنی مادی ترقی کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ اگر حقیقتاً ہم نہیں جانتے کہ کتنی اَور انتہائیں اپنی ابتداؤں کی منتظر ہیں۔ مَیں نے آپ کو خوش بخت اس لئے کہا ہے کہ زندگی کا وہ چیلنج جو آج سے نصف صدی پہلے نو واردانِ عرصۂ تنگ دنیا کے سامنے آتا تھا اِس دعوتِ مبارزت کے سامنے ہیچ ہو چکا ہے جو زمانہ آج آپ کو دے رہا ہے۔ پھر کیا آپ خوش قسمت نہیں ہیں کہ آپ کے بازوؤں کی توانائیاں، ذہنوں کی روشنیاں، قلوب کی گرمیاں اور ارواح کی بالیدگیاں اُس جہانِ تازہ کے مسائل سے پنجہ آزما ہونے والی ہیں جسے خالقِ ارض و سماء کے جدید ترین ارادے اور مصالح معرضِ وجود میں لا رہے ہیں اور جسے رُوحِ حیات اور رُوحِ آدم دونوں خوش آمدید کہہ رہی ہیں ــــــ

میرے عزیزو! یہ ساعتِ سعید جو آپ کے سر پر آن پہنچی ہے اپنے اندر بے پناہ ممکنات رکھتی ہے۔ یہ وقت ڈرنے اور تامّل کرنے کا نہیں ہے۔ زمانہ زبانِ حال سے بار بار پکار رہا ہے کہ اے نیند کے ماتو اور اے مئے غفلت کے متوالو! ــــــ اُٹھو کہ کاروانِ حیات کو برق و باد کے پر لگ گئے ہیں اور وہ صدیوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کرتا چلا جا رہا ہے، اور اس کی تیز رفتاری کی ہی نسبت سے اس کا اُفق بھی پھیلتا اور دُور تر ہوتا جا رہا ہے۔ پھر وہ کون پست ہمّت ہے جو آخر شب کی اِن گھڑیوں میں فرسودگی کی چادر اوڑھے سوتا رہے گا اور تقدیر کی اِذاں سُننے سے انکار کر دے گا۔

عزیزانِ گرامی! آپ ایک اور اعتبار سے بھی خوش بخت، بلکہ بدرجہ غایت خوش بخت ہیں۔ آپ نے ایسی رُوح افروز روایات ورثے میں پائی ہیں جو آپ کی معاصر قوموں کو نصیب نہیں ہوئیں۔ مسیح ناصری کی اُمّت کے خداوند خدا نے انسان سے مایوس اور بیزار ہو کر کہا تھا Dust thou art & to dust returneth یعنی اے انسان تو خاک ہے اور تیرا ملجا و ماویٰ بھی خاک ہے۔ لیکن اسلام کے خدا نے یہ فرما کر کہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم، اس کا رتبہ کائنات کی سب بلندیوں سے بلند اور موجودات کی تمام شرافتوں سے شریف تر کر دیا اور بنی آدم کو نوید دی کہ لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین تم اپنے آپ کو کمزور مت جانو اور اس احساس سے اپنے آپ پر حزن و ملال، مایوسی اور ناامیدی مت طاری کرو کیونکہ اگر تم اپنے خدا پر اور اس کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنے آپ پر ایمان رکھو گے تو تم اس کائنات کے سب سے اونچے مقامات پر فائز کئے جاؤ گے ـــــ میرے بچو! جس اُمت کو ایسا بے نظیر عقیدہ اور ایسا روح افروز وعدہ بارگاہِ الٰہی سے ارزانی ہو چکا ہو اُسے زمانے کا بڑے سے بڑا چیلنج قبول کرتے ہوئے کیا خوف آئے گا، اس کا ہاتھ اس کے خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اور اگر وہ اسے مضبوطی سے تھام لے تو کائنات کی لامحدود وسعتیں اس کے زیرِ قدم آنے کو بے تاب و بے قرار ہو جائیں گی ـــــ یاد رکھئے کہ مادی ترقیات کے اس بے مثال عہد میں ہمیں آج بھی مغربی اقوام پر ایک تفوّق حاصل ہے اور وہ ہے ہمارے اس رُوحانی ورثے کا تفوّق، جو ہمیں جنابِ رسالت مآب سے ملا ہے۔ یاد رکھئے کہ عرب کے ایک یتیم لڑکے نے دنیا کی وہ سب سے بڑی حکومت قائم کی جس کی بنیاد بنی نوعِ انسان کی اخوت پر رکھی گئی تھی۔ اور جس کا آئین خود خداوند جل و علیٰ کا آئین تھا۔ دنیا کی بڑی سے بڑی قاہر اور طاغوتی طاقتیں مٹ گئیں کیونکہ وہ استعمار پر قائم تھیں۔ وہ انسان کو انسان کا غلام بنا کر استحصال بالجبر کے ذریعے خدا کی بادشاہت کو آسمان سے زمین پر لانے کی بجائے اسے زمین سے یکسر رخصت کر دینے میں مسلسل کوشاں رہیں اور آج اپنے مادی عروج کے نصف النہار پر پہنچ جانے کے بعد بھی کوشاں ہیں۔ امریکہ میں خدا کے سیاہ فام بندوں پر آج بھی باآبرو زندگی کے دروازے بند ہیں۔ روس کی بے پناہ وسعتوں میں خدا کا نام کہیں سُننے میں نہیں آتا۔ اور ان دونوں کے درمیان دُنیائے فرنگ مادی کامیابی کے ہیولوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑی جا رہی ہے اور نہیں جانتی کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ خداوند جل و علیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہم جب پیچھے مُڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں فاران کی بلندیوں کے عقب سے تجلیاتِ رشد و ہدایات کی رُوح افروزیاں آج بھی نصیب ہوتی ہیں اور جب ہم قرآن کریم کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہمیں خلافتِ الٰہی کے تقاضوں کا بھولا ہوا سبق آج بھی ارزانی ہوتا ہے ؎

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا ‏ ‏ ‏ ‏ خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں ‏ ‏ ‏ ‏ کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

میرے نوجوان دوستو! آپ کی میری خوش بختی یہ ہے کہ آپ نے جس ادارے میں تعلیم و تربیت پائی ہے وہ دُنیا میں دین کے امتزاج کا ایک نہایت متوازن تصوّر پیش کرتا ہے نہ صرف پیش کرتا بلکہ اسے عملِ مسلسل میں ملبوس بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ہم اس کالج کو ایک معیاری مکمّل اور منفرد کلّیہ کی حیثیت وصورت میں دیکھ سکیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ جہاں کام کو کام نہیں بلکہ ایک مشن تصوّر کیا جاتا ہے، جہاں طلباء کو فقط پڑھایا نہیں جاتا بلکہ ان کے مزاجوں میں ایک کوہ شکن سنجیدگی اور کردار میں ایک شریفانہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے۔ اور جہاں اساتذہ کی قربانیاں اور جانفشانیاں اپنے پیچھے ایک کہکشاں نور چھوڑتی چلی جاتی ہیں، اہلِ خیر کی تمنّائیں کیوں نہ فروغ پائیں گی اور اہلِ علم کے عزائم کیوں نہ پُورے ہوں گے۔ آپ اب زیورِ علم سے آراستہ ہو کر زندگی کی دہلیز پر کھڑے ہیں اور کوئی دن کی بات ہے کہ آپ اپنی آنے والی مصروفیات میں گُم ہو کر رہ جائیں گے۔ لیکن یاد رکھیئے کہ اب آپ کی عملی زندگی کے ساتھ آپ کی علمی زندگی کا بھی آغاز ہوگا۔

کالج کے سنہری ایّام محض تیاری کے ایّام تھے۔ یہاں آپ نے تحصیلِ علم کا فقط ذوق حاصل کیا ہے۔ حقیقی تحصیل کا زمانہ اب آرہا ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس تحصیل کو اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور پھر بھی اسے نامکمل سمجھتے ہیں۔ علم کی اس منزل کو قرآنِ کریم نے حکمت کے نام سے سرفراز کیا ہے۔ یاد کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت کو ہمیشہ دو علیحدہ علیحدہ حیثیتیں عطا کی ہیں یعلّمھم الکتاب والحکمۃ۔ پس طالب علم، علم کو حکمت کی منزل تک نہیں پہنچاتا وہ ایک ایسا مسافرِ شب ہے کہ منزل کو افق پر دیکھتے ہی سو جاتا ہے۔ چنانچہ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ اس مشعلِ نور کو جو آپ نے کالج کے شبستانوں میں جلائی تھی زندگی کے ایوانوں میں بھی برابر روشن رکھیں اور اسی کے نور میں وہ راستہ تلاش

کرتے چلے جائیں جسے ہماری کتاب مقدس نے اللہ کی سبیل کہا ہے! اور از بس کہ اللہ ہی خیر تمام ہے اور وہی تمام قوتوں کا سرچشمہ، تمام نصرتوں کا منبع اور تمام ہدایتوں کا مرکز ہے۔ اسی لئے ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص اللہ کے راستوں پر چلے گا یعنی کائنات کی عقدہ کشائیوں میں اُسی کے نورِ ہدایت سے مدد لے گا، اپنے چاروں طرف خیر و برکت پھیلانے کو اپنا منصبِ انسانی سمجھے گا، دنیا کے زر و مال سے متمتع ضرور ہو گا لیکن اپنے مقامِ بلند کے پیشِ نظر اسے اپنے جُوتوں کی خاک ہی سمجھے گا آنکھوں کا سُرمہ نہیں بنائے گا اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں اپنے کم نصیب بھائیوں کو شامل کرنا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھے گا۔ اسے اولئك هم المفلحون کی صف میں یقیناً جگہ ملے گی اور وہ دنیا کی کسی حقیقی مسرت اور عقبےٰ کی بے حساب دولت سے ہرگز ہرگز محروم نہیں رکھا جائے گا۔

پس اے نونہالانِ قوم اپنے سروں کو جُھکا کر اِس مادرِ علمی سے اجازتِ رخصت لو اور جب اس کی حدود سے نکلو تو سروں کو پھر سے بلند کر لو کہ اللہ کی سرزمین اللہ ہی کے اطاعت شعار بندوں کی میراث ہے خدا کرے تمہارے ایمان اپنے خالق پر اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں کی بدولت خود اپنے آپ پر ہمیشہ تازہ رہیں اور جب بھی اِس نخلستانِ علم اور اس ایوانِ سکون و عافیت کا خیال تمہارے دلوں میں آئے تو ان نفوسِ قدسی پر اپنا سلام بھیجنا ہرگز نہ بھولو جنہوں نے تمہارے ذہنوں کو جلا بخشی، تمہارے کردار کو تعمیر کیا اور تمہیں ایک تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے سے پنجہ آزمائی کے لئے تیار کیا۔ وما توفیقنا الا باللہ العلی العظیم۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم ٭

○

ہے عمل میں کامیابی موت میں ہے زندگی

جا پٹ جا لہر سے دریا کی کچھ پروا نہ کر

○

امجد محمود نوشہروی
اولڈ بوائے

"خونِ جگر ہونے تک" پر ایک نظر

خونِ جگر ہونے تک فضل احمد کریم فضلی کا ناول ہے جس میں انہوں نے مشرقی پاکستان کی عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے۔ بنگال کی زندگی کے متعلق زبان کی اجنبیت اور طول طویل مسافت کے باعث ہم بہت کم جانتے ہیں۔ ہمیں بنگال کی زندگی کے نقشے ٹیگور کے افسانوں اور ناولوں میں ملتے ہیں۔ عوامی کہانیوں میں وہاں کی معاشرتی۔ تمدنی اور اخلاقی اقدار کے مرقعے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ متحدہ بنگال کے متعلق ایک پرانے مصنف " لال بہاری دے" نے "Peasant Life of Bengal" کے نام سے ایک ناول آج سے تیس یا چالیس برس قبل انگریزی زبان میں لکھا تھا جو پسماندہ بنگال کی دیہی زندگی کا آئینہ ہے۔ ڈاکٹر عشرت حسین نے بھی Men and River کے نام سے ایک ناول انگریزی زبان میں لکھا ہے جس میں بنگال کے سیلابوں اور طوفانوں سے وہاں کے باشندوں پر جو مصیبتیں آئے دن نازل ہوتی رہتی ہیں قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ اگرچہ بنگالی میں افسانوں اور ناولوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن مغربی پاکستان کے لوگ بنگالی سے ناآشنا ہونے کے باعث اُن سے بہت کم آشنا ہیں۔ فضلی خود عرصۂ دراز تک بنگال میں حکومت کے مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے ہیں۔ آپ نے وہاں کے عوام کی زندگی کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ناول میں مشرقی پاکستان کی زندگی کو پیش کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ یہ تو مستقبل کا نقاد اور ادیب ہی اندازہ لگا سکے گا کہ فضلی کا یہ ناول کس حد تک جاندار ہے لیکن ایک عام قاری بھی ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ بنگالی عوام کی زندگی مغربی پاکستان کے ماحولِ زندگی سے کتنی مختلف ہے اور دونوں کے معیارِ زندگی، روزمرہ کے مسائل و معاملات میں کس حد تک تضاد و تناقض ہے۔ اِس ناول کے مطالعے سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ فضلی نے بنگالی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ناول کے کردار بڑے جاندار ہیں اور ناول میں جو مقامی رنگ ہے وہ صرف بنگال کی خاک سے مختص ہے۔ مصنف کا بنگال کی زندگی سے شغف اور اس کی صحیح ترجمانی کی کوشش کا ثبوت اِس سے بھی ملتا ہے کہ اُس نے دوسرے اردو مصنفین کی طرح ستھری اور صاف ادبی زبان استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اُس کی بولی بعینہٖ اُنہی الفاظ کا مجموعہ ہے جو بنگال میں رائج ہیں۔ کرداروں کے اِسلامی ناموں کی تحریف شدہ شکلیں پورے ناول میں ہر جگہ ملتی ہیں۔

متحدہ ہندوستان میں دو صوبے پنجاب اور بنگال اپنی اندھا دھند عقیدت اور پیر پرستی کے لئے مشہور تھے اور آج بھی مشہور ہیں چنانچہ اِس ناول میں اِس معاشرتی لعنت کا بھی ہمیں خاصا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

کہانی کا آغاز دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے کچھ ہی دنوں پہلے ہوتا ہے اور پورا ناول جنگ کے اثرات کا آئینہ دار ہے۔ پہلے باب میں ہم ناول کے اہم کرداروں سے روشناس ہوتے ہیں جن میں سے سب سے زیادہ جاذبِ توجہ "جمعدار صاحب" ہیں جن کے گرد پوری کہانی گھومتی ہے، دوسرا کردار جو جمعدار صاحب کی شخصیت کے اُبھارنے میں پیش پیش ہے وہ پھول محمد ہے۔ اسی باب میں جمعدار کی بیوی اہلیہ جان بھی ہمارے سامنے آتی ہے ہم جمعدار کے چھوٹے بچے بھانو اور جلو دھر اور سرت ساہا سے متعارف ہوتے ہیں اور یہ سب کردار بنیادی ہیں اور انہی کے گرد پلاٹ کا سارا تانا بانا بُنا جاتا ہے۔ ان میں سے جمعدار خالص انگریزی حکومت کی پیداوار ہے جسے پہلی جنگِ عظیم نے جنم دیا اور جو لوکر شاہی استبداد اور بر خود غلط قسم کے فوجی عملے کا ایک نمونہ ہے لیکن ناول کی رفتار کے ساتھ اس کی بے مغز اور لایعنی گفتگو اور دعاوی کے ساتھ ہی ساتھ اس کے کردار کے بعض عمدہ پہلو نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور کہانی آخر میں اس کے مذہبی شغف اور دینداری کے ساتھ دم توڑ دیتی ہے۔ جلو دھر بھی اسی ماحول کی پیداوار ہے اور جنگِ عظیم کے دوران جن اسباب نے اشتراکیت کو فروغ دیا انہی نے جلو دھر کو بھی ہم سے روشناس کرایا۔ وہ عام کمیونسٹوں کی طرح بغاوت کے جذبات سے معمور عام بے چینی پھیلانے پر مستعد اور اخلاقی اقدار کا جوا سر سے اُتار پھینکنے میں پیش پیش نظر آتا ہے۔ اِسی طرح سرت ساہا کا کردار جو ابتدا میں جمعدار کے بہی خواہ کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ آگے چل کر قصبے کی تباہی اور فاقے کی بلا باشندوں پر مسلط کرنے میں سب سے آگے ہے۔ سرت ساہا ہندوستانی بنیئے اور سرمایہ دار کی علامت ہے جو اپنے مفاد کے لئے کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ ساہوکارانہ ذہنیت کا جیتا جاگتا مجسمہ ہے جو آج بھی پاک و ہند میں ہمیں ہر طرح سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے جس کی پیشانی پہ قوم فروشی، بے ایمانی، سنگ دلی اور ظلم کے نشانات درخشاں ہیں۔ مصنف نے اس کردار کو اتنی مفصل جزئیات سے پیش کیا ہے کہ اس طبقے کی ذہنیت سے جو نفرت اور بے زاری وہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں پوری طرح کامیاب رہتا ہے۔ پھول محمد جس سے ہم ابتدائی سطروں میں ملاقی ہوتے ہیں بظاہر ایک لاابالی اور لاپرواہ مسخرہ نوجوان نظر آتا ہے جس کا کام جمعدار سے موقع بے موقع ٹھٹھول ہے وہ اُن کے بگڑنے پر اپنے دلچسپ اور برموقع جملوں سے انہیں ٹھنڈا کرتا ہے لیکن آگے چل کر پھول محمد کے کردار کی بعض ایسی خصوصیات نگاہوں کے سامنے آتی ہیں۔ اور اس کی پختگیٔ کردار اور شرافتِ نفس کے وہ نمونے دکھائی دیتے ہیں کہ جن سے بنگال کے دہقانی طبقے کے نوجوانوں کی مخصوص کرداری بلندی کا ایک نقشہ کھنچ جاتا ہے اور ہمیں یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ دیہاتی جوان اخلاقی لحاظ سے پڑھے لکھے تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقے کے شہری نوجوانوں سے کہیں زیادہ معصوم و عزت دار اور بلند کردار ہوتے ہیں اور ان کے اندر وہ

التباسات نہیں ہوتے جن کا آج کل کا متمدن نوجوان بالعموم شکار ہوتا ہے۔ پورے ناول میں اس کا کردار بڑا بے داغ اور جرأت مندانہ نظر آتا ہے۔ ایسے مواقع پر جہاں جمعدار صاحب کے بھی پاؤں اکھڑ جاتے ہیں اور وہ لغزش پر آمادہ نظر آتے ہیں پھول محمد کا عزم انہیں گڑھوں میں گرنے سے بچا لیتا ہے اور وہ آخر دم تک ایک جیتا جاگتا کردار بنا رہتا ہے۔

یہ ناول بھوکے بنگال کا ایک لفظی مرقع ہے جسے مصنف نے کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ دوسری جنگ کے دوران بنگال پر جو کچھ گزرا اور فن کاروں نے جو مرقعے مختلف رنگوں میں پیش کئے وہ اس مرقعے کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ قحط کے زمانے میں پیر میاں، صرت سلہا اور مخلص الرحمٰن اور نگن بابو سب کے کردار اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے بڑا بھیانک اور گھناؤنا منظر پیش کرتے ہیں۔ اور اسی قحط میں جمعدار کی بیوی اور ماجدہ کی شخصیتیں بھی ابھرتی ہیں اور یہ جاہل غیر تعلیم یافتہ اور دیہاتی عورتیں نسوانی دنیا کے ایسے جاذبِ توجہ کردار پیش کرتی ہیں کہ جن پہ کوئی بھی سماج فخر کر سکتا ہے۔

مجید صاحب کی حیثیت نوکر شاہی کی ہے لیکن وہ ان معدودے چند امٹ انسانوں میں سے ہیں جو اپنے مرتبے اور مقام سے غلط فائدہ اٹھانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ چنانچہ مدرسے کی بنیاد رکھتے وقت، طوفان میں گھرنے کے بعد، اور قحط کے زمانے میں انہوں نے جس دور اندیشی اور خدمتِ خلق کا مظاہرہ کیا ہے وہ اس بات پہ دال ہے کہ دنیا نیکوں سے کبھی خالی نہیں ہوتی اور ان کے کردار کی اہمیت اور بلندی خان صاحب پیر میاں کے مدِمقابل آکر اور بھی اجاگر ہو جاتی ہے۔ موخر الذکر شروع سے آخر تک ابن الوقت ہونے کا پورا ثبوت دیتا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ سماج دشمنوں کے گروہ جو امارت اور ہوشیاری اور چالاکی سے لوگوں کو دھوکہ دیکر اور حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونک کر معراجِ ترقی پہ پہنچ جاتے ہیں اور ضمیر فروشی اور بے حسی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ پیر میاں اس گروہ کے واحد اور حقیقی معنی میں نمائندے ہیں۔ کوئی بھی ایسا موقع نہیں آتا کہ جہاں انہوں نے جمعدار کو جو اخلاقی حیثیت سے ان سے بہت بلند تھا اور جس کے پہلو میں ایک دھڑکتا دل اور مذہب و ملت کا جذبہ موجود تھا نیچا دکھانے کی کوشش نہ کی ہو۔

جاز ایلی صاحب سماج کے ان بگڑے نوجوانوں میں سے ہیں جن پر اعلیٰ تعلیم اور یورپ کا سفر اپنے پورے تاثرات مرتب کرتا ہے۔ برطانوی ہند میں ایسے لوگوں کی کبھی کمی نہیں رہی جو اپنے مرتبے اور تعلیم سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ جاز ایلی صاحب بھی اسی گروہ کے نمائندے ہیں۔ اور اسی وجہ سے پیر میاں سے ان کی خوب نبھتی ہے۔ یہی لوگ بنگال کے قحط اور تباہی کے سب سے بڑے ذمے دار ہیں۔ ان کا احساسِ برتری کبھی بھی انہیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے مقام سے نیچے اتر کر بھوک سے تڑپتے انسانوں کے دکھ درد میں شریک ہو سکیں۔ انگریزی حکومت کی سب سے بڑی لعنت یہی مغرب زدہ طبقہ ہے جس نے برصغیر ہند و پاک کو

انگریزوں کی غلامی میں ڈیڑھ سو سال تک گرفتار رکھا اور کبھی حکامِ بالا کو عوام کے جذبات سے باخبر کرنے کی کوشش نہیں کی اور عوام کی جانوں اور عزتوں سے کھیلتے رہے۔

چوں کہ خود مصنف اسی گروہ سے متعلق ہے اس لئے اس کی پردہ دری اور غمازی صداقت سے پُر ہے اور مصنف نے جس مقصد کے لئے ناول میں یہ کردار پیش کئے ہیں ان کا جواز ہماری سمجھ میں آجاتا ہے۔

جیسا کہ ابتدائی سطور میں اشارہ کیا گیا تھا ناول میں ضمنی کرداروں کی بھی کمی نہیں ہے اور ان میں سے بعض کردار ناول کی اٹھان میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثلاً مولوی نور الانوار، پیر صاحب چاند شیخ، اس کی بیوی اور گیدو کی ماں وغیرہ جو افسانے کے آگے بڑھنے اور ربط قائم رکھنے میں اہم کڑیوں کا کام کرتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی "خون جگر ہونے تک" نہ صرف یہ کہ مخلوط ہندوستانی اور پاکستانی معاشرت کا ایک پُر صداقت نمونہ ہے، بلکہ اگر اسے ایک آئی سی ایس افسر کے بے لاگ تاثرات کا مجموعہ اور جذبات کا آئینہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اکثر فرض شناس حاکموں کے ضمیر کی آواز حالات کی ناموافقت کے باعث دب جاتی ہے۔ یہ انہی آوازوں کا مجموعہ ہے +

○

"ہاتھی کا شکار بہت مشکل ہے کیونکہ ہاتھی سپورٹسمین بالکل نہیں ہوتا۔ ہاتھی ایک کینہ خُو اور ایک کینہ نواز جانور ہے۔ اگر کوئی ہاتھی سُن رہا ہو تو میں معافی چاہتا ہوں لیکن یہ بات سچ ہے کہ اگر ہاتھی ایسا نامعقول نہ ہوتا تو شکاریوں سے اتنی سی بات پر خفا کیوں ہوتا؟ شکاری فقط اُسے مار ڈالنا ہی چاہتے ہیں نا اور تو کچھ نہیں چاہتے۔ اور اتنی سی بات کے لئے اتنا بغض رکھنا، بدلے لینا، بیر کرنا، وہ کرنا، یہ سب باتیں ہاتھی کو انسانیت سے گرا دیتی ہیں۔ اور جانوروں کو دیکھئے، شکاریوں سے کتنی اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ دسمبر سن ۔۔ میں کا ذکر ہے۔ ۱۵ تاریخ تھی اور یہی رات کے کوئی گیارہ بجے تھے۔ میں جنگل میں بیٹھا ایک ہاتھی کا انتظار کر رہا تھا۔ کم بخت نے بڑا پریشان کیا۔ آخر رات کے دو بجے کہیں آیا۔ اکیلا نہیں، ایک اور ہاتھی کو بھی ساتھ لے آیا۔ میں نے گولی چلائی۔ میرے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ گولی فقط ایک ہاتھی کو لگی، دونوں ہاتھیوں کو نہیں لگی۔ ایک ہاتھی وہیں بیٹھ گیا۔ دوسرا میری طرف لپکا۔ اگلے روز مجھے پتہ چلا کہ وہ ہتھنی تھی ۔۔۔۔ یعنی مسز ہاتھی۔

(شفیق الرحمٰن) ۔۔۔۔ دلہری لے ۔۔۔۔

سلیم اختر صدیقی ایم۔اے
(اولڈ بوائے)

اقتصادی ترقی

موجودہ دنیا جس دَور سے گزر رہی ہے اُسے ہم معاشی نظریات میں اختلافات کا دَور اور مادّی رنگ میں ایکدوسرے سے سبقت لے جانے کا دَور کہہ سکتے ہیں۔ ہماری دنیا اِس وقت دو گروہوں میں منقسم ہے یعنی (۱) نظامِ اشتراکیت جس کا علمبردار روس ہے اور (۲) نظامِ سرمایہ داری جس کا علمبردار امریکہ ہے۔

لیکن میرے مضمون کا تعلق اِن دونوں میں سے کسی کے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بالمقابل میں چند ایسے بنیادی مسائل کو زیرِ بحث لانا چاہتا ہوں جن کا ہماری زندگی سے قریبی تعلق ہو اور ہماری معیشت سے گہرا رابطہ ہو ــــ نفسِ مضمون کی طرف رجوع سے پہلے معاشیات کی وضاحت کو ناضروری سمجھتا ہوں۔

علمِ معاشیات کے متعلق کچھ غلط نظریات قائم کر لئے گئے ہیں۔ مثلاً چند دنوں کی بات ہے کہ مجھ سے ایک صاحب دریافت فرما رہے تھے کہ میں کس مضمون کا طالب علم ہوں؟ اور جب میں نے اُنہیں بتایا کہ میں معاشیات کا طالب علم ہوں۔ تو انہوں نے بڑی لاپرواہی سے کہہ دیا کہ یہ بھی کوئی مضمون ہے۔ بس بنیا پن ہے جس میں اخلاقی اقدار کا کچھ حصّہ نہیں۔ اور پھر یہ مسلم انسان کو دنیادار بنا دیتا ہے۔ مجھے اُن صاحب سے اِس قسم کی باتیں سُن کے ازحد کوفت ہوئی۔ کیونکہ وہ اچھے خاصے پڑھے لکھے ہوئے بھی تھے۔ مگر میرا اِس واقعہ کے لکھنے سے ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر پڑھا لکھا اور صاحبِ عقل و فہم اِس قسم کے خیالات رکھتا ہے لیکن پھر بھی میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ اِس بارے میں چند وضاحتی فقرات تحریر کر دوں۔

علمِ معاشیات سے کیا مراد ہے؟ اِس بارہ میں ابتدائی ماہرینِ معاشیات میں کافی اختلاف رہا ہے۔ اِس علم کے اساتذہ میں سے ایڈم سمتھ اور مارشل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق وہ چند اصول جو کہ مادی ترقی اور بہتری میں ممد و معاون ہوں اُن کے مطالعہ کا نام علمِ معاشیات ہے۔ مگر یہ تجزیاتی قسم کا مطالعہ نہ تھا۔ ناقدین کے درمیان اِس بارہ میں بڑی لے دے ہوئی۔ کیونکہ جو چیز مادی ترقی میں شامل نہ ہو وہ علمِ معاشیات کے دائرۂ بحث میں نہیں آسکتی۔ مثلاً استاد کا سکول میں بچوں کو پڑھانا مادی بہتری میں شامل نہیں ہو سکتا مگر اس کے مقابلہ پر حلوائی کا مٹھائی تیار کرنا مادی بہتری کا ایک حصّہ ہے

اِن حالات میں وہ مسائل جو واضح طور پر علمِ معاشیات کا حصّہ ہونا چاہیئے تھے وہ اِس معیار کے تحت اس کا حصّہ نہیں بن سکے۔ اِس مکتبِ خیال کا نام (MATERIAL WELFARE SCHOOL) ہے مگر بعد میں ایک پروفیسر جن کا نام لائنل رابنز ہے اور جو لندن سکول آف اکنامکس میں استاد ہیں انہوں نے علمِ معاشیات کی ایسی تعریف کر دی ہے کہ جس پر دورِ حاضر کے تمام ماہرینِ معاشیات متفق ہیں۔ اُن کے بیان کے مطابق معاشی مسئلہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہماری ضروریات

اور خواہشات کے مقابلہ میں اُن کو پورا کرنے والے ذرائع محدود ہوں۔

یہ اِس قسم کی تعریف ہے جو ہر طرح سے قابلِ قبول ہے۔ مثلاً سکول کے استاد کا مسئلہ اُس وقت معاشیات کا ایک مسئلہ بنے گا جب طلباء کی تعداد کہیں زیادہ ہوگی اور اس کے مقابلہ میں اساتذہ کی تعداد کم ہو، یا مسئلہ اسکے برعکس ہوسکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک نظریاتی مطالعہ ہے۔

موجودہ دَور میں معاشی ترقی و بہبود کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اب تمام پسماندہ ممالک اِس کوشش میں مصروف ہیں کہ وہ جلد سے جلد شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوں اور اپنے معیارِ زندگی کو جلد از جلد بلند کریں مگر معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا مسئلہ تو اُس وقت ہمیں درپیش ہوگا جب ہم اپنی اہم ضروریات کو پورا کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ ایشیا اور افریقہ کے اکثر ممالک اِس وقت غربت و افلاس، بھوک اور تنگدستی میں مبتلا ہیں اور ہمارے وطنِ عزیز پاکستان کی حالت ایشیا کے ممالک میں سب سے زیادہ قابلِ رحم اور قابلِ توجہ ہے۔ پچھلے دنوں ایک اخبار میں مشرقِ بعید کی معاشی حالت کے متعلق چند اعداد و شمار شائع ہوئے تھے جن سے پاکستان کی معاشی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ اعداد و شمار کولمبو پلان کے تحت اکٹھے کئے گئے تھے۔ جن ممالک کے اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں اُن کے نام درج ذیل ہیں:۔

برما۔ کمبوڈیا۔ سیلون۔ بھارت۔ انڈونیشیا۔ لاؤس۔ ملایا۔ نیپال۔ شمالی بورنیو۔ پاکستان۔ فلپائن۔ ساراوک سنگاپور۔ تھائی لینڈ اور ویٹ نام۔ یہ ممالک دنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل ہیں اور دنیا کا ۱/۴ حصۂ زمین ان کے قبضے میں ہے۔

آمدنی فی کس فی سال:۔

(۱) پاکستان - ۱۹ پونڈ - تقریباً ۲۵۳ روپے -

(۲) سنگاپور - ۱۴۰ "

(۳) ملایا - ۹۶ "

(۴) ساراوک - ۷۱ "

(۵) فلپائن - ۶۹ " (پاکستان ٹائمز - ۲ر جولائی سنہ ۶۱ء)

اس کے مقابلہ میں آبادی اور پیدائش کی رفتار کے لحاظ سے ہمارا ملک ان پسماندہ ممالک سے نسبتاً سبقت لئے جارہا ہے۔ اِن حالات میں اگر اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا ملک کس قدر پسماندہ ہے۔

اِس سلسلہ میں ایک اور بات یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ کوئی صاحب یہ خیال کرسکتے ہیں کہ مادی طور پر ترقی کرنا ہمارے مذہبی جذبہ کے خلاف ہے۔ یہ امر قطعاً غلط ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہمیں خود دعا سکھائی ہے کہ ہم اُس سے دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی، دونوں کے طلبگار ہوں۔ مگر جو کام ہم اِس مادی دنیا میں کریں اُس کے پس منظر میں محض خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کی طلب ہو۔ دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ کام خواہ دین کا ہو یا دنیا کا ہمارا اصل مقصود خدا تعالےٰ

کی ذات ہی ہو۔ مگر اِس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جائیں۔ بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی محبت کو دنیاوی محبت پر ہر حالت میں غالب رکھیں۔ اور جب تک ہم اپنے مادی اور معاشی وسائل کو مضبوط تر نہ بنائیں گے ہم کس طرح خدا تعالیٰ کے پیغام کو دنیا تک پہنچا سکیں گے؟ ویسے اگر خدا تعالیٰ چاہے تو آئندہ طلوع ہونے والا دن ایک انقلابی دن ثابت ہو سکتا ہے اور سب دنیا مسلمان ہو سکتی ہے۔ ہم تو صرف کوشش کر سکتے ہیں برکت خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اور کوشش ہم اُسی صورت میں کر سکتے ہیں جب ہم مالی طور پر مضبوط اور توانا ہوں۔ اِس لئے اقتصادی ترقی کے لئے کوشاں ہونا قطعاً مذہبی رُوح کے منافی نہیں۔

اقتصادی ترقی کے ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ **اقتصادی ترقی انسانی کوششوں کا نتیجہ** ہوتی ہے۔ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تو ہمیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ یہ بالکل عام فہم سی بات ہے کہ جب تک ہم کسی چیز کے لئے کوشش نہیں کریں گے اُس چیز کا خود بخود عمل میں یا وجود میں آنا ناممکنات میں سے ہے۔ البتہ معجزات سے ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ خارق عادت واقعات روز روز اور ہر شخص کے لئے وقوع پذیر نہیں ہوتے۔ عام حالات میں یہ بات ممکن نہیں کہ ہم سارا دن آرام سے سوئے رہیں اور کھانے کے اوقات میں ہمارے لئے بہترین قسم کا مرغن کھانا آجائے چائے کے وقت خود بخود چائے آجائے اور جس وقت سیر کے لئے طبیعت چاہے تو باہر خود بخود ایک بہترین کار کھڑی ہو۔ اور یہ سب کچھ بغیر کسی کوشش اور محنت کے میسر آجائے۔ یہ احمقوں والا خواب ہوگا۔ ہمارا ماحول ہمیں مقابلہ کی دعوت دیتا ہے۔ اور جو شخص یہ چیلنج قبول کرتا ہے گویا وہ اِس بات کے لئے تیار ہے کہ تجربات کرے، ترقی کے مواقع تلاش کرے۔ اور جب ایک شخص یا ایک قوم اجتماعی طور پر مقابلہ کے لئے تیار ہو جائے گی تو پھر اُس کے لئے ترقی کے مواقع بہم ہوتے چلے جائیں گے اور وہ قوم اقتصادی طور پر ترقی کر سکے گی۔ مگر اس کے لئے ایک جذبہ کی ضرورت ہے۔ لیکن جب ہم اپنے ماحول کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سوسائٹی میں مختلف گروہ ہیں جن کے نظریات مختلف ہیں، جن کی اقدار متضاد ہیں۔ اِن نظریاتی اور قدرتی اختلافات کی کئی نفسیاتی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مثلاً سوسائٹی میں ایک ایسا گروہ موجود ہے جس کے نزدیک مادی ترقی کے حصول کے لئے کوشش کرنا ایک گناہ ہے۔ اس کے خیال میں دنیا فانی ہے اس لئے دُنیا کے لئے کوئی کام کرنا عبث ہے اور بہتر یہ ہے کہ ساری عمر عبادت میں گزار دی جائے۔ اِسکے بالمقابل ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جس کے عقیدہ کے مطابق مادی خواہشات کو ختم کرنا روحانی ترقی کا باعث ہے۔ مثلاً کچھ لوگ متواتر روزہ رکھتے ہیں اور صرف اتنا ہی کھاتے ہیں کہ جس سے سانس کی ڈوری بندھی رہے اور اپنے آپ کو ہر آرام و آسائش سے دُور رکھتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق اِس قسم کے اعمال سے انسان پرمیشر کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اِس قسم کا خیال ہندوؤں میں موجود ہے۔ اور پھر وہ سادھو بھی خاص توجہ کے قابل ہیں جو اپنے سر میں راکھ ڈال لیتے ہیں اور عمر کا کثیر حصہ دریاؤں کے کنارے کھڑے یا بیٹھے گزار دیتے ہیں۔

اس کے مقابل پر عیسائیت میں رہبانیت کا طریق ہے۔ یہ لوگ گرجا گھروں میں جو کچھ کرتے ہیں وہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ پھر بدھ مت کے ماننے والوں میں ایک کثیر جماعت لاماؤں کی ہے جو ساری عمر بھیک مانگ کے گزارہ کرتے ہیں اور اس طریق سے نفس کشی کرتے ہیں۔ اس قسم کے مذہبی عقائد یقیناً نقصان دہ ہیں۔ تبت کا سارا ملک لاماؤں سے بھرا ہوا ہے۔

بہرحال اس فلسفہ نے انسان کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ معیارِ زندگی کو رزقِ حلال کے حصول میں کسی مذہبی عقیدہ کی مداخلت نہیں ہونا چاہیئے۔ مذہب اسلام نے اس بارہ میں بہت اعلیٰ اور قابلِ عمل تعلیم دی ہے ـــ اسلام رہبانیت کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان دنیا میں زندگی بسر کرے لیکن اپنے خالق و مالک کے آستانہ پر جھکا رہے۔ وہ دنیا کے کام بھی کرے لیکن دست با کار اور دل بایار کی عملی تصویر ہو۔ لہذا غیر اسلامی فلسفے اقتصادی ترقی میں روک رہے ہیں۔

دوسری بات جو اس سلسلہ میں قابلِ توجہ ہے اور جس کا اقتصادی ترقی سے گہرا تعلق ہے یہ ہے کہ دولت کے حصول اور دولت کے صرف میں بہت فرق ہے۔ ایک شخص کو فن سے قطعاً دلچسپی نہیں ہے مگر چونکہ اس کے پاس دولت ہے اور وہ معاشرہ میں اپنا وقار قائم کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ اپنے مکان میں ایک آرٹ گیلری قائم کر لیتا ہے۔ اس قسم کی خود نمائی اور خود فریبی کسی صورت میں بھی اس شخص کے لئے فائدہ مند نہیں۔ کیونکہ اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ آرٹ کا قدردان بن جائے بلکہ وہ یہ اہتمام اس لئے کرتا ہے کہ معاشرہ میں اسے فن کا پرستار سمجھا جائے۔ ایسی حرکات صرف اُن لوگوں سے سرزد ہوتی ہیں جن کے ہاتھ میں یک لخت دولت جمع ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ دولت کے ذریعہ ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں تاکہ اُن کی برتری اونچے یا حکمران طبقہ میں تسلیم کر لی جائے۔ انگریز کی حکومت نے اس قسم کے اثرات چھوڑے ہیں۔ مقامی لوگوں نے کوشش کی کہ وہ بھی حکمران طبقہ میں اپنا مقام پیدا کر سکیں۔ اسی لئے اچھے اچھے شریف گھرانوں کی عورتوں نے پردہ ترک کر دیا، سر کے بال کٹوا دیئے اور سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ سامانِ تعیش پر بے دریغ روپیہ خرچ کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ اس دولت کو اقتصادی ترقی کے منصوبوں پر خرچ کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد دو طبقے پیدا ہو گئے۔ یعنی امیر بہت امیر ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی روایات کو قربان کر کے جھوٹی روایات کو تلاش کیا اور اس طرح حکمران ٹولی کے منظورِ نظر ہو گئے۔ اس کے مقابل پر دوسرا طبقہ بہت پیچھے رہ گیا۔

دولت اقتدار کا ذریعہ بھی ہے، چاہے اسے رشوت سے حاصل کیا جائے یا سیاسی اقتدار سے۔ مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ دولت لازمی طور پر اقتدار کا ذریعہ بن جائے۔ ہر سوسائٹی میں نظریات مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً ہندوؤں میں جو قدر غریب برہمن کی ہو گی وہ کسی امیر ترین شودر کی ہرگز نہ ہو سکے گی۔ اور یہ امر بالکل واضح ہے کہ ان حالات میں بھی اقتصادی ترقی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر ایک سوسائٹی میں سپاہی کی قدر ہے تو لوگ کوشش کریں گے کہ وہ بھی فوج میں بھرتی ہوں۔ مگر وہ سوسائٹی جس میں ایسے شخص کی قدر کی جاتی ہے جو تنظیمی قابلیت رکھتا ہو تو وہ اسی طرف کوشاں ہوں گے

مگر مجموعی طور پر دیکھا گیا ہے کہ دولت حصولِ اقتدار کا باعث ہے۔ اگر ایک آدمی کے پاس روپیہ ہے تو اس کی سوسائٹی میں قدر ہے۔ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایسی سوسائٹی میں یقیناً معیارِ زندگی بلند کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور جس وقت معیارِ زندگی بلند کرنے کی خواہش پیدا ہوگی یقیناً وہ اس کے حصول کے لئے کوشاں بھی ہوگا۔ جب یہ انفرادی کوششیں اجتماعی کوششوں میں تبدیل ہو جائیں گی تو اقتصادی ترقی کے لئے راستہ بھی کھل جائے گا۔ موجودہ معاشرہ میں دولت، عزت اور طاقت کا آپس میں بہت مضبوط رشتہ ہے۔

اب تک جو بحث ہوئی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا فلسفہ جو کہ دنیاوی چیزوں سے نفرت سکھائے وہ اقتصادی ترقی میں روک پیدا کرتا ہے اور اسلام نے قطعاً اِس قسم کا کوئی فلسفہ پیش نہیں کیا۔ اِسی غلط فہمی کی بنا پر روس نے مذہب کو ایک افیون قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روٹی کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ ہے اور جب تک اِس مسئلہ کو حل نہ کیا جائے گا اُس وقت تک عوام مذہب میں کما حقہٗ دلچسپی نہیں لیں گے۔

جب تک ہم اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے ہمارے استحکام اور ہماری توانائی کا خیال محض خیال ہی رہے گا ——— اور ہم دوسرے اہم ترین امور کی طرف توجہ نہیں کر سکیں گے! اقبال نے شوخی کے انداز میں یہ بات یوں بیان کی ہے کہ ؎

مریدے فاقہ مست گفت با شیخ
کہ یزداں را ز حالے ما خبر نیست
بما نزدیک تر از شہ رگِ ماست
ولیکن از شکم نزدیک تر نیست

● ۔ "کوئی عمدہ چیز حاصل کر لینا خوبی نہیں ہے، خوبی تو اسے عمدہ طریقے سے استعمال کرنے میں ہے۔" (جانسن)

○

● ۔ "اگر مجھ سے خدا کا تصور چھین لیا جائے تو میں پاگل ہو جاؤں۔" (ولسن)

(بشکریہ عبدالرحیم انجم)

نسیم اختر صدیقی
(گیارھویں کلاس)

غالبؔ — جدید اُردو نثر کا نقیب

غالبؔ کو اُردو ادب میں کئی لحاظ سے اہمیت حاصل ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس نے نہ صرف شاعری میں بلکہ نثر میں بھی مروجہ رسوم کو توڑ کر حقیقت نگاری کی طرف قدم بڑھایا۔ غالبؔ کا قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ موجودہ اُردو نثر کا بانی ہونا بجائے خود ایک عجیب حقیقت ہے۔

ایک صدی قبل کی اور آج کی اُردو نثر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اُس وقت کی اُردو نثر تصنعات اور تکلفات سے بھرپور ہوا کرتی تھی۔ فصاحت و بلاغت سے مرصع نثر بہت پسند کی جاتی تھی۔ بے شک یہ نثر عوام الناس کی سمجھ سے کہیں بالا ہوا کرتی تھی۔ لیکن اِس کے باوجود وہ اِس لاش کو بہت پسند کرتے تھے۔ اُردو نثر اور نظم میں فرق کرنا مشکل تھا۔ گو ایسی نثر کو ادبی لحاظ سے ایک گراں قدر شے سمجھا جاتا تھا، مگر اس کا فائدہ کچھ نہ تھا۔ کیونکہ یہ عوام کے خیالات کے اظہار کا وسیلہ نہ بن سکی۔ اور عوام کے خیالات کی ترجمانی کے قابل نہ ہونا زبان کی سب سے بڑی خامی اور کمزوری ہے

رفتہ رفتہ اُردو کا میدان وسیع تر ہوتا گیا۔ تکلفات کے بادل چھٹے تو غالبؔ کی نثر کا مہرِ عالمتاب طلوع ہوا۔ غالبؔ میر مہدی مجروحؔ کو خط لکھتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"جب تک یوں نہ لکھو خط ہی نہیں، چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ اگر تمہاری خوشنودی اِسی پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی مَیں نے بھی لکھ دی ہیں۔"

غالبؔ نے ایسے حالات میں اپنے لئے ایک نئی راہ ڈھونڈی۔ غالبؔ نے اُردو نثر کو سادہ، سلیس اور جامع الفاظ کا وہ جامہ پہنایا جس نے اُردو نثر کو آسان تر بنا دیا۔ اگرچہ غالبؔ نے اُردو نثر کی کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ لیکن اس کے باوجود غالبؔ کو ان کے خطوط کی وجہ سے ہی اُردو نثر نگاری کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ غالبؔ کے خطوط میں سادگی، شیرینی اور حلاوت ہے۔ آفاق حسین صدیقی لکھتے ہیں :-

"اُردو نثر کی ارتقا میں غالبؔ کا بڑا حصہ ہے۔ اگر مرزا نے آج سے سو سال پہلے سادہ اور بے تکلف اندازِ تحریر اختیار نہ کیا ہوتا تو شاید اِس وقت ہماری زبان میں اسی طرح کی عبارت آرائی کی جاتی اور ہم اسی طرح قوافی کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے۔ غالبؔ نے اپنے ملکۂ انشا پردازی سے سادہ زبان میں

بے تکلفی، شیرینی، لطافت اور ظرافت کا رس بھر کر اپنے اندازِ تحریر کو بے حد دلکش، سہل اور ممتنع بنا دیا ہے۔ اور اپنی تخصیت کی بوقلمونی، طبیعت کی شگفتگی اور زورِ قلم کو کام میں لا کر اپنے اندازِ بیان کو وہ تابندگی اور زبان کو وہ تازگی بخشی جس کے سامنے بڑے بڑے انشاء پردازوں کی نگارشات ماند پڑ گئیں۔ ہر چند مرزا کے بعد بھی بڑے نثار پیدا ہوئے۔ اور اُردو زبان کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ لیکن کوئی غالب تک نہ پہنچ سکا۔" (نادراتِ غالب صہ ۹۵)

غالب نے جب یہ طرز اختیار کی تو اس کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا اور بہت سے اعتراضات کئے گئے لیکن غالب نے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

کا اصول قائم رکھا۔ ان خطوط کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مشکل الفاظ کے بے موقع اور بے جا استعمال سے اجتناب کیا ہے بلکہ الفاظ کو ایسے انداز میں استعمال کیا ہے کہ اگر ایک لفظ بھی غالب کی نثر میں سے نکال دیا جائے تو مضمون خبط ہو کے رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کا قول ہے کہ:-

"غالب نے اپنے خطوط کے اندر جدت پیدا کی۔ تکلفات کو یک قلم ترک کر کے رکھ دیا اور سادہ الفاظ کو ایسے انداز میں استعمال کیا جو مقصد پر دلالت کرتے تھے۔ غالب کی اس جدت پسندی پر نہ صرف عوام نے بلکہ اُدبا نے بھی اعتراضات کئے۔ مثلاً سرور نے غالب کی اس نثر کو دلی کا روڑا بتایا اور اس کے جواب میں عبارت کا نہایت پُر تکلف انداز اختیار کیا اور اس میں قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی تو خوب ہے۔" (اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ صہ ۵۲)

"ان سے پہلے پڑھے لکھے لوگ بالعموم فارسی میں خط و کتابت کیا کرتے تھے اور اُردو میں بھی لکھتے تو فارسی آمیز مقفیٰ اور پُر تکلف عبارت لکھتے تھے۔ خط کا بڑا حصہ رسمی القاب و آداب میں صرف ہو جاتا تھا۔ مرزا غالب نے ۱۸۴۷ء کے قریب اُردو میں خط لکھنا شروع کئے۔ انہوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ ترک کر دیا۔ عام طور پر اس طرح خط لکھتے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ نیز یہ عبارت نہایت بے تکلف اور برجستہ ہے۔ اس میں جا بجا ظرافت کی چاشنی ہے۔" (اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ صہ ۵۶)

"اس کے علاوہ ان خطوط میں بہت سی علمی اور ادبی باتیں تھیں۔ غالب نے اپنے بعض مشکل الفاظ کی تشریح کی ہے۔ بعض لغات اور تراکیب کے معنے سمجھائے ہیں۔" .....

"پھر ان کا اسلوب بیان نہایت صاف اور سادہ ہے۔ آگے چل کر اُردو نثر کے لئے جو سادہ اور سلیس انداز اختیار کیا گیا اس کا پہلا نمونہ غالب کے خطوط میں ملتا ہے اور اسی بنا پر غالب کو جدید اُردو نثر کا نقیب کہتے ہیں۔" (اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ صہ ۵۶)

ہدایت اللہ ہادی
(بارھویں کلاس)

خواجہ حیدر علی آتش

اٹھارھویں صدی کے لکھنو کا ایک صاحبِ طرز شاعر —— جب اس دور کے استاذ الاساتذہ شیخ امام بخش ناسخ سے فنِ شعر کی بساط پر معرکہ آرا ہوا تو اردو شاعری کو ایک عظیم فتح حاصل ہوئی —— اردو تاریخ کی زبان ناسخ کے اس حریف کو خواجہ حیدر علی آتش کے نام سے پکارتی ہے!

اس عظیم شاعر کا نام خواجہ حیدر علی تھا اور تخلص آتش تھا —— ان کے والد بزرگوار خواجہ علی بخش، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد منتقل ہو گئے۔ آپ دہلی کے ایک معزز خاندان سے نسبی تعلق رکھتے تھے اور اپنے زمانۂ حیات میں بڑی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قدرت نے انہیں ایک نامور بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ فیض آباد میں خواجہ حیدر علی آتش کی پیدائش ہوئی۔ مورخینِ اردو ادب نے خواجہ کا زمانہ پیدائش ۱۷۷۸ء قرار دیا ہے۔

گردشِ شام و سحر نے اس بچے کو ایک عظیم صدمہ کی گود میں ڈال دیا۔ ابھی یہ بچپن کی حدود میں ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور یتیمی کا تلخ بوجھ اس کے نازک اور کمزور کندھوں پر آ گرا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواجہ حیدر علی آتش معقول تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ انہیں زندگی بھر اپنی اس تعلیمی محرومی کا شدید احساس رہا۔ اس علمی کمزوری کے باوجود ان کے ذہن و قلم نے اردو شاعری کے خزانہ میں جو قابلِ قدر اضافہ کیا ہے وہ ان کے نام کی بلندی کے لئے کافی ہے۔

یتیمی کے اندوہناک سایوں میں گھرے رہنے کے باوجود ان کی طبعی شگفتگی کو غمِ زندگی کی خزاں دھیما نہ کر سکی۔ وہ ہمیشہ دنیائے اشک و آہ کے جلو میں بھی مسکراتے رہے۔ جوان ہوئے تو مزاج میں ایسی ترنگ پیدا ہوئی کہ مایوسیوں اور اداسیوں کے بھیانک اندھیرے بہت دور بھاگ گئے۔ شوریدہ سری نے جذبات و خیالات میں ایک بے بہا بانکپن پیدا کر دیا۔ اور یہ تمام جوہر جب شاعری کی بساط پر جلوہ گر ہوئے تو طبیعت کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ چنانچہ خود ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا ٭ کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

"کہتی ہے تجھ کو" —— کے ٹکڑے میں جو لطیف احساس جھلک رہا ہے اسے ایک حساس دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ اور بخوبی لذت گیر ہو سکتا ہے۔

بڑھاپے کا دور آیا لیکن جوانی کی ترنگ، جذبات کا مد و جزر، گفتگو کا بانکپن بدستور قائم رہا اور آخر دم تک اپنی

سپاہیانہ وضع کو نہایت ہی عمدہ انداز سے نباہا۔

شاعری کا آغاز ہوا اور طبعی صفات و ازلی جواہر نے ان کی فکری قوتوں کی مکمل حمایت کی۔ ان دنوں جرأت، انشاء اور مصحفی کے معرکے اپنے شباب پر تھے۔ ایک دوسرے پر بڑی شدت سے لے دے ہو رہی تھی۔ اِس ماحول نے شعر و سخن کے خفتہ و محفوظ جذبات کو بیدار کر دیا اور آپ بھی اِس میدان میں کُود پڑے۔ ذہنی طور پر مصحفی کی شاعری سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ لہٰذا انہی کے شاگرد ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی شاعرانہ صلاحیتیں اُبھر آئیں۔ بڑی شُستہ و شگفتہ غزلیں کہیں۔ ہم عصروں نے ان کی شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف کیا اور ادب کے ناقدین نے آپ کو متفقہ طور پر ایک صاحبِ طرز استاد تسلیم کیا۔ بچپن ہی سے طبیعت میں استغناء کا جوہر موجود تھا اور اس جوہر نے اُن کی وضعداری کو آخری عمر تک بحال رکھا۔ جب تک زندہ رہے خودداری اور درویشانہ انداز کو کبھی ترک نہ کیا۔ آخر ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ کی سرزمین میں جامِ اجل نوش کیا اور اسی مٹی میں دفن ہوئے۔

اُردو غزل کی سطح پر آتش کی اپنی الگ حیثیت اور الگ مقام ہے۔ اکثر ناقدین نے آتش و ناسخ کی غزل کا مقابلہ کرتے ہوئے آتش کو فوقیت دی ہے۔ مرزا غالب نے بھی یہی رائے پیش کی ہے کہ :-

"ناسخ کے ہاں کمر اور آتش کے ہاں بیشتر نشتر ہیں"

تاہم مرزا غالب کی رائے کو تسلیم کرنے کے باوجود اِس امر کو بھی ماننا پڑے گا کہ ناسخ اور آتش کی شاعری میں بیشتر اقدار و خصوصیات مشترک ہیں۔ اور جہاں تک قواعدِ زبان اور فنِ عروض کا تعلق ہے آتش کا درجہ ناسخ سے بہت نیچے ہے آتش نے غزل کو ایک نفیس لب و لہجہ عطا کیا ہے۔ آپ کا کلام زیادہ دلآویز اور زیادہ تاثیر کا حامل ہے۔ زبان بے حد صاف اور شستہ ہے۔ مضمون آفرینی کے علاوہ آپ رعایتِ لفظی کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ مثلاً ؎

تکلّف سے بَری ہے حُسنِ ذاتی ؛ قبائے گُل میں گُل بُوٹا کہاں ہے

آپ اپنے شعر میں جس موضوع کو باندھتے ہیں اِس بات کی خاص احتیاط کرتے ہیں کہ ان کے فکر کی شوخی، رنگینی، رعنائی، موضوع کو زیادہ سے زیادہ پُرکشش بنا دے۔ آپ کے دیوان میں اِس قسم کے بے شمار اشعار موجود ہیں جو اِس خاص حُسن کی غمازی کرتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر ؛ ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

اِس شعر میں آتش کی نزاکتِ فکر قابلِ داد ہے۔ غربت کی وادی کسی کو پسند نہیں ہے۔ اس لئے کہ اجنبیت کا خوف ہر وقت ایک غریب الوطن کو ڈستا رہتا ہے۔ لیکن آتش نے غربت کے لفظ سے بھی ایک ایسا سچا پہلو تراش لیا ہے کہ غربت کی وادی سے محبت کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ یعنی "اجنبیت" جو وجہِ ہراس تھی وہی اجنبیت اس اعتبار سے وجہِ سکون بن جاتی ہے کہ کم از کم یہاں کسی غریب الوطن کے دُکھ درد کا کوئی مذاق تو نہیں اُڑا سکتا۔ آتش کی شاعری میں لطافتِ فکر کے علاوہ ایسے اشعار

بھی عام ملتے ہیں جو ان کی طبعی ندرت پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کے اشعار پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص انفرادی انداز میں سوچتے ہیں۔ ان کا شعر محض ندرتِ فکر کی بدولت ضرب المثل بن چکا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بڑا شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا ؎ جو چیرا تو اِک قطرۂ خوں نہ نکلا

آتش کی شاعری رموزِ محبت کی بھی آئینہ دار ہے اور اس میں میر درد کا سا صوفیانہ رنگ بھی موجود ہے۔ ان کے ہاں خوبصورت استعارے اور نادر تشبیہات کی بھی کوئی کمی نہیں۔ منتخب محاورات کو برمحل استعمال کرنے میں انہیں ایک خاص سلیقہ حاصل ہے۔ وہ اپنے دَور کے بہترین غزل گو اور صاحبِ طرز استاد تھے۔ بعض اشعار تو اس قدر مؤثر ہیں کہ اُن کی نظیر ڈھونڈنا مشکل ہے۔ بساطِ عالم پر یک گونہ نارسائی کے باوجود اپنا نقشِ دوام ثبت کر گئے ـــــ کیا ہوا کہ محبوب کی محفل میں باریابی نہ ہوئی ـــــ

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
مَیں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

"یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں تیز انعکاس اور میر کی طرح درد و اثر کی تڑپ نہیں ہے پھر بھی ان کے بعض اشعار پوری اُردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔ بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ جذبات کو نہایت مؤثر اور دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ فوق البھڑک الفاظ ان کے ہاں بہت کم ہیں۔ زبان بہت مزیدار اور روزمرہ کی بول چال ہے جس میں ابتذال نہیں ہے۔ شعر بآسانی سمجھ میں آتے ہیں اور بہت لطف دیتے ہیں۔ محاورات بہت منتخب اور برمحل ہوتے ہیں۔ تلاشِ الفاظ بہت قابلِ تعریف ہے۔ خیالات میں بلندی ہے۔ اگرچہ غالب کی ایسی نہیں اور عموماً فواحش سے پاک و صاف ہیں۔"

(تاریخ ادب اُردو) "رام بابو سکسینہ"

سعید انجم
(بارھویں کلاس)

منٹو ـــــ ایک عظیم فنکار

انسان خطا کا پتلا ہے اور انسان غلط کار ہے لیکن جب کوئی شخص ہمیں ہماری غلطیوں پر آگاہ کرتا ہے تو ہم چڑ جاتے ہیں کیونکہ یہ بھی ایک غلط کاری ہے اور غلط کاری ہماری سرشت میں ہے ـــــ

منٹو غلط کار تھا کیونکہ وہ ہماری غلطیوں کو معاف نہیں کرتا تھا۔ اس کا قلم نشتر ہے جو معاشرہ کے ناسوروں کو چیرتا چلا جاتا ہے ـــــ آخر وہ زندگی کے انہی ناسوروں سے بہتے ہوئے گندے مواد میں بہہ گیا ـــــ آنچ دیتے ہوئے زخموں نے اسے بھی خاکستر کر دیا۔ یہی اس کا فن تھا کہ :۔

"منٹو نے اپنے خاک وخون سے اپنے نحیف و ناتواں جسم کی خاکستر کو آنسوؤں میں گوندھ کر بہت سے بت بنائے اور انہیں اولادِ آدم کے سامنے خالی تہہ نشینوں اور طاقچوں میں چن دیا"

("منٹو" ابو سعید)

منٹو اپنی تحریرات میں اپنے خاص ڈرامائی انداز میں جگہ جگہ معاشرے کی جعلی داڑھیاں نوچتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور منٹو کے ہاتھوں سے نوچی ہوئی اکثر داڑھیاں ہمیں "گنجے فرشتے" میں نظر آتی ہیں۔ اس اپنے ملک کے سادہ لوح لوگوں کو جو جھوٹے پیروں اور ملنگوں کے ہتھے چڑھ کر اپنی تمام دولت کو ان کی عیاشیوں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں بچانے کی خاطر لکھا ہے :۔

"جلالت مآب بزرگ، جن کی شرعی داڑھیوں، نورانی چہروں، مقدس دستاروں، بے داغ عباؤں اور دور رس نگاہوں کو دیکھ کر شیطان بہروپ بھرنا بھول جائے۔ خوش عقیدہ عوام ان کے دامِ فریب میں اس بری طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ہل نہیں سکتے۔ یہ دلوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ راکھ کا سونا بناتے ہیں اور ان کی خاکِ پا لاعلاج مریضوں کا علاج ہے۔ ان کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج بے روزگاروں کو روزی دلواتے ہیں۔ ان کی دوکانوں پر حُب کے تعویذ فروخت ہوتے ہیں جن سے سنگدل محبوب رام ہوں۔ ان کے کالے علم سے دشمن زیر ہوں اور مقدمے جیتے جائیں۔ یہ بانجھ کو بچہ دیں اور کنواریوں کے آسیب اتاریں" (مٹی کے کنارے)

منٹو نے زندگی کے بہت سے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اس لئے اس نے زندگی کے بہت قریب ہو کر اس کا مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ خود لکھتا ہے:۔

"میں یہ کہانیاں صرف اس لئے لکھتا ہوں چونکہ مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے ...... میرا روئے سخن یا تو اپنی طرف ہوتا ہے یا اُن چند افراد کی طرف جو میری تحریروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں ادب سے دور اور زندگی سے قریب تر ہوں۔"

پھر منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:۔

"زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہیئے جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ جیسی کہ وہ تھی یا جیسی ہوگی اور جیسی ہونی چاہیئے۔"

پھر ایک افسانے میں اس کا ایک کیریکٹر سوچتا ہے:۔

"زندگی کیا ہے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں سوچتا ہوں یہ ایک اونی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے اور ہم اس جراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں۔ جب اُدھیڑتے اُدھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ طلسم جسے ہم زندگی کہتے ہیں ٹوٹ جائے گا۔"

پھر ایک اور مقام پر کہتا ہے:۔

"میری زندگی ایک دیوار ہے جس کا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹوں کو پراگندہ کر دوں۔ کبھی جی میں آتا ہے کہ اس ملبے کے ڈھیر پر ایک نئی عمارت کھڑی کر دوں۔"

منٹو زندگی یا روگ کے فن پارے بناتا ہے لیکن سوائے فنی سانچے کے وہ کسی سانچے کا قائل نہیں۔ اختر اورینوی لکھتے ہیں:۔

"منٹو سوکھے جنگل میں ایک ہرا بالا درخت نہیں وہ بھرے ہوئے باغ کا ایک سر برآوردہ شجر ہے۔ کہتے ہیں جہاں چندن وہاں ریشہ چندن۔ مگر منٹو ایک لہکتے چہکتے چمن زار کا گل لیتو لودا ہے جس کی طرف سب کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔ منٹو کی یہ بہت بڑی اہمیت ہے کہ وہ اونچوں میں اونچا اور خوبصورتوں میں جاذب نظر خوبصورت ہے۔"

منٹو حقیقت پسند تھا اپنے ان مزاحیہ ڈراموں کے متعلق جو اس نے شروع شروع میں ریڈیو اسٹیشن کے لئے لکھے تھے لکھتا ہے:۔

"یہ ڈرامے روٹی کے اس مسئلے کی پیداوار ہیں جو اردو کے ہر ادیب کے سامنے اس وقت تک رہتا ہے جب تک وہ مکمل طور پر ذہنی اپاہج نہ ہو جائے۔ میں بھوکا تھا چنانچہ میں نے یہ ڈرامے لکھے۔ داد اس بات کی چاہتا ہوں کہ میرے دماغ نے میرے پیٹ میں گھس کر یہ چند مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں جو دوسروں کو ہنساتے رہے ہیں مگر میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی پیدا نہ کر سکے۔"

پھر منٹو کو چاہے سیاست سے کچھ تعلق نہ تھا لیکن پھر بھی اس نے وقت کو پہچانتے ہوئے ایسی بات کہی جو

اُس وقت کے ہر ذی شعور انسان کے ذہن میں تھی۔ وہ لکھتا ہے :۔

"ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ جو ملک کی فضا بگاڑ رہے ہیں۔ یہ نام نہاد لیڈر اپنی اپنی بغل میں ایک ایک صندوقچی دبائے پھرتے ہیں۔ جن میں یہ لوگوں کی جیبیں کتر کتر کر روپیہ جمع کرتے ہیں۔ ان کی ہر سانس میں آپ کو ریاکاری اور دغابازی کا تعفّن محسوس ہوگا۔ لمبے لمبے جلوس نکال کر بھاری ہاروں کے نیچے دب کر چوراہوں پہ طویل طویل تقریروں کے کھوکھلے الفاظ بکھیر کر یہ نام نہاد لیڈر اپنا راستہ بناتے ہیں جو عیش و عشرت کی طرف جاتا ہے .... یہ لوگ چندے اکٹھے کرتے ہیں لیکن کیا انہوں نے آج تک بیکاری کا حل پیش کیا ہے ؟ .... یہ لوگ جن کی رُوح لنگڑی، دماغ اپاہج، زبان مفلوج اور ہاتھ پیر شل ہیں ملک و ملّت کی راہبری کیسے کر سکتے ہیں؟.. ...... ہندوستان کو بے شمار لیڈروں کی ضرورت نہیں بلکہ صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں ملک و قوم کی خدمت کر سکتا ہو اور پھر کرے۔"

منٹو نے انسان کو آئینہ دکھایا جس کے نتیجہ میں لوگوں نے اُس کو بُرا بھلا کہا۔ گندے گندے خطابات دیئے اور اس کے افسانوں کو عُریاں ثابت کیا لیکن دراصل وہ زندگی کے گھناؤنے پہلو تھے جہاں سے روشنی کی لکیر تک نہ گزرتی تھی اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہاں روشنی کر سکتا۔ منٹو نے ہمت کی اور اُن کو ننگا کر دیا۔ ابوسعید قریشی اپنی کتاب "منٹو" میں لکھتا ہے :۔

"منٹو قارئین کو اُن مقامات پر لے گیا جہاں لوگ چوری چھپے جایا کرتے تھے۔ اُس نے اُن کرداروں کو جن سے کوئی دن کے اُجالے میں اپنی جان پہچان کا اشارہ تک نہیں کرتا فلڈ لائٹس میں لا کھڑا کیا اور کہا ان کو دیکھو پہچانو۔ تم اِنہیں جانتے ہو ....

.... یہ انسان ہیں، یہ بھی انسانوں کی طرح دُکھ درد ذلّت عزّت سب کچھ محسوس کرتے ہیں۔ ان کے پہلو میں بھی گوشت پوست کا دل دھڑکتا ہے۔ یہ بھی محبت، نفرت اور حقارت کے احساسات سے آگاہ ہیں —— اِن کا احترام کرو اور سوچو کہ اگر یہ ذلیل ہیں تو کیوں ذلیل ہیں۔ اِنہیں گالی دیتے وقت یہ سوچ لو کہ تم گندمیں کھڑے ہو۔ اِن پر پھٹکار بھیجتے وقت ذرا اپنا مُنہ بھی آئینہ میں دیکھ لیا کرو۔"

یک چمن گُل

- پروین پروازی
- نسیم قدسی
- ہدایت اللہ ہادی
- اظہر سلیم سلیمی

اجنبی

اِک زمانہ ہُوا

ایک گمنام سی
راہ کے موڑ پہ
دو مسافر ملے!
چند لمحے رُکے
اور پھر چل دیئے
اجنبی ہو گئے

ان کے دل میں مگر
ایک بے نام سی
آرزو کی کلی
کِھل اُٹھی!
بات کچھ بھی نہ تھی
اِک فسانہ ہُوا،
اِک زمانہ ہُوا

نعیم قدسی

پشیمانی

گزرتے ہوئے وقت کے سخت لمحوں کے سینوں میں رفتار کی تیز کرنوں کے بھالے چبھوتی ہوئی
ڈولتی، جھومتی، ڈگمگاتی ہوئی
چیختی ریل کے ایک ڈبے میں بیٹھا ہوں میں

مرے ساتھ بیٹھا ہوا ہے مرا ایک دیرینہ دوست
جو اِس وقت شاید سفر کی تھکن اور اذیت کے ہاتھوں سے مجبور ہو کر
کسی ماہ رُو کی طلسمی نگاہوں کے مبہم اشاروں میں کھویا ہوا ہے

مرے سامنے کچھ ستائے ہوئے بوڑھے چہرے بھی ہیں
یہ چہرے جو گُم ہیں ——— گئے موسموں، بیتے سالوں کی اُڑتی ہوئی دُھول میں
یہ چہرے جو تحریر ہیں
یہ چہرے جو ابہام ہیں

مرے داہنے ہاتھ کو اِک کھُلی ہوئی اُونچی کھڑکی سے باہر
جواں رُت کے امرت اثر سے
جواں کھیتوں کی ان بہکتی قطاروں میں دوشیزگی کا چھلکتا خرام
مخالف سے آتے ہوئے اُونچے پیڑوں کی بوجھل قطاریں
پہاڑی چٹانوں کا بھاری تسلسل
گھنے بادلوں کے طربناک سائے

چمکتی ہوئی دھوپ، پانی، نشیب و فراز
یہ سب میرے اطراف پر سے گزرتے چلے جا رہے ہیں
(اور اب)

سیہ فام لوہے کی پٹڑی پہ چلتی ہوئی ریل کی
چیختی اور کربناک حرکت
بتدریج مدھم ہوتی جا رہی ہے
بس اِک لمحہ ——— ! اور ریل رُک جائے گی

اور اِسی لمحے میں سوچتا ہوں اگر میں
ہواؤں کی مانند اُڑتی ہوئی ریل سے کُود جاتا
تو میرے مخالف سے آتے ہوئے اونچے پیڑوں کی بوجھل قطاریں
پہاڑی چٹانوں کا بھاری تسلسل
مرے جسم کی دھجیاں لُوٹ لیتا

یا میں ان کے رُخ کو بدلتا
زمانے کے پیروں میں اپنے اِسی آہنی عزم کی بیڑیاں ڈال کر
نئی چال چلتا

تو مجھ کو یقیں ہے
مرا نام تاریخ میں لوگ سونے کے پانی سے لکھتے !

نعیم قدسی

مُورت

چاند سے شیتل پھول سے کومل
کالی آنکھوں والی
رُوح کا نغمہ، نیند کی مریم
مدھ ماتی متوالی
حُسن کی سیتا، عشق کی آذر
آوارہ، انجان
لیکن پتھر ہونٹوں والی
بے حس اور بے جان

شیخ اظہر سلیم سلیمی
(بارھویں کلاس)

حالِ دل

امید دل کو جب ایک ٹھوکر لگی
خیالوں کے عقدے الجھنے لگے

تصور کی دنیا میں ہلچل مچی
کہانی، ہر اک بات بنتی گئی
سحر ایک ابھری مرے ذہن سے
ابھرتی رہی رات بنتی گئی
شگوفے کھلے کھل کے مرجھا گئے
بہار آئی آفات بنتی گئی
اندھیرا اجالوں کو کھانے لگا
مری جیت بھی مات بنتی گئی
جسے چاہا نوچوں خیالات سے
وہ تصویر بالذات بنتی گئی

غم دل کا لاوا ابلتا رہا
ترے پیار کا دیپ جلتا رہا

ہدایت اللہ ساحری

رشتۂ دوام

سُنا ہے آمادۂ وفا ہو!
سُنا ہے تجدیدِ ساعتِ رفتہ چاہتے ہو!
مَیں کیسے ناکامیٔ تمنّا کو بھول جاؤں؟

تری ندامت کا بوجھ بھی اب اُٹھا رہا ہوں
خلش ہے دل میں
مگر مَیں خوش ہوں ——— مَیں مطمئن ہوں
کہ تیرے دل سے قریب تر ہوں!

جو دیپ روشن ہے کُنجِ تنہائی میں،
اسے بھی! مَیں نے!
جگر کے خوں سے کیا ہے روشن!
مرے سلگتے ہوئے آنسوؤں کی شبنم
مری نگاہوں سے ہے گریزاں!!
مَیں تشنۂ آرزو ہی اچھا
کہ آرزو کی بقا یہی ہے۔

دامِ خیال

● مختار احمد

● ابنِ قاضی

مختار احمد

اکیلا

یہی بات ہے داؤد سے مل کر میں بے حد مایوس ہوا۔ اُس کی گفتگو اور اُس کے لباس کو دیکھ کر اگر میں کچھ سوچ سکتا تھا، تو یہی کہ ——— "جعفری نے اس جیسے شخص کو اپنا دوست کیسے بنا لیا ہے ———؟"

ایمانداری سے کہتا ہوں آج کی دوستی تو کالج میں انعام میں ملے ہوئے کپ پر چڑھی پالش کی طرح ہوتی ہے کہ چند دن گزرنے کے بعد پالش غائب ہو جاتی ہے اور نیچے سے سیاہ رنگ کی دھات منہ چڑانے لگ جاتی ہے۔ کچھ ایسی حالت دوستی کی بھی ہوتی جاتی ہے۔ جہاں تک کوئی اُمید وابستہ رہتی ہے، غرض پوری ہونے کی توقع رہتی ہے، دوستی بھی چلتی رہتی ہے۔ بلکہ لوگ ہاتھ پہ ہاتھ مار کے کس خوبصورتی سے کہتے ہیں "وہ تو میرا لنگوٹیا ہے جی ——— "اگر کسی کے پاس کھانے کے لیئے پیسے، پہننے کے لیئے کپڑے اور گھومنے کے لیئے کار ہو تو اتنے دوست بن جاتے ہیں کہ جان عذاب میں پڑ جاتی ہے۔ میں حیران اِس بات پہ تھا کہ داؤد کے پاس ان میں سے کچھ نہ تھا۔ اس کے باوجود اس کے اتنے سارے دوست تھے۔

ہم تین چار دوست تھے جو شام کو پبلک لائبریری میں اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ وہاں سے نکل کے کسی سستے سے ریستوران میں بیٹھ کے چائے پیتے اور اگر باہر سڑک پہ کوئی آنچل لہراتا ہوا دکھائی دیتا تو ہم مار دھاڑ سے بھرپور تصویر دیکھ کے بکھر جایا کرتے۔ جعفری لائبریرین تھا۔ اتنا فراخ دل کہ کیا مجال جو کسی ممبر کو اُس نے کبھی کوئی کتاب دی ہو لیکن ہمارے لیئے وہ چابیاں ہاتھ میں لیئے پھرتا تھا۔ شاید اس لیئے کہ اُسے چائے پلانے کو ہماری جیب میں پیسے ———

ایک شام کو جو اپنے دفتر سے نکل کے لائبریری پہنچا تو صبح سے منڈلاتے ہوئے بادل ایک دم برس پڑے، وہ بھی ایسے جھما جھم کہ پل بھر میں جل تھل ہو گیا۔ جعفری کو سلام کر کے میں دریچے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ مجھے تیز بارش بہت بھلی لگتی ہے۔ سوچتا ہوں، پھنسنے کی بجائے اگر کبھی سڑک پر نکل جاؤں تو کیسا رہے۔ باہر کی چیزوں کو پانی میں شرابور ہوتے دیکھ رہا تھا کہ جعفری میرے پاس آیا۔ رُک کے اُس نے ایک ہاتھ میرے کندھے پہ رکھا، پھر چھنگ پہ آئی ہوئی عینک کو اُوپر چڑھایا اور بڑے سپاٹ سے لہجے میں کہنے لگا۔

"آؤ تمہیں ایک اُلو سے ملاؤں" ——— میں نے فوراً مڑ کے دیکھا۔ جعفری بے تکلف اور بے ضرر قسم کا آدمی ہے۔ نہ کسی سے محبت، نہ کسی سے نفرت۔ زندگی سے اُسے نفرت نہیں، تو پیار بھی نہیں لیکن جب کبھی وہ گالی دینے پہ آتا ہے

تو پھر اُس کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے اُس کا بس چلے تو گالی نہ دے کچا چبا جائے ـــــــ اور بس اسی لیے نہیں چلتا کہ بیچارے کے جسم پر گوشت نام کو نہیں۔ سر کے گِنے چُنے بالوں کو ملتا ہوا وہ آگے چل دیا اور میں اُس کے پیچھے۔ کاؤنٹر کے پاس پہنچے تو اُس نے ایک طرف لے جا کر تعارف کرایا۔

"داؤد صاحب ـــــــ یہ میرے دوست عثمان ہیں اور یہ داؤد ـــــــ" داؤد اپنی جگہ سے اُٹھا، ہاتھ ملایا، نہ سرد مہری تھی نہ گرم جوشی۔ اور پھر سے کرسی میں دھنس گیا۔ اُس کا حُلیہ دیکھ کے میرے ذہن میں آیا بھی کہ جعفری سے پوچھوں "یہ کس بھنگی سے ملا رہے ہو" لیکن پوچھ نہ سکا۔ بارش اُسی شدّت سے ہو رہی تھی اور شاہ صاحب، چودھری اور شریف ابھی تک آئے نہ تھے۔ کاؤنٹر کے پاس ہی دوسری کرسی میں میں بھی دھنس گیا۔

داؤد اور جعفری بڑے اطمینان سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ اکثر لائبریرینوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کبھی کسی نے کسی کتاب کے متعلق بات کی، یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولنے لگ جاتے ہیں لیکن جعفری کا معاملہ اُلٹ تھا کسی بحث یا تفصیل سے اُسے اختلاج ہونے لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اُسے بہت کم کسی بحث یا رائے میں حصّہ لیتے دیکھا۔ اب بھی وہ داؤد سے بات کر تو رہا تھا لیکن بے تعلق سا الگ رہا تھا۔ یوں جیسے وہ اِس بلا سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔ سچ پوچھیے تو داؤد کسی بلا سے کم تھا بھی کہاں۔ میں نے ذرا غور سے اُس کے سراپا کا جائزہ لیا۔

یہی کوئی پینتالیس پچاس برس عمر ہو گی اُس کی۔ رنگ قریب قریب سیاہ تھا۔ چہرہ خوفناک تو نہ تھا لیکن دیکھنے والے کو وحشت ضرور ہوتی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، گال پچکے ہوئے اور اُوپر کے اگلے دانت یوں باہر نکلے ہوئے جیسے کوئی دیمک پھنس رہا ہو۔ سارے چہرے پر چار چھ روز کی بڑھی ہوئی شیو کے سفید بال۔ بھنویں نیم سفید البتہ مونچھوں میں کہیں کہیں سیاہ بال دکھائی دے جاتا تھا۔ سر کے بال گھنے تھے کنپٹیاں ہی سفید ہوئی تھیں باقی بال سیاہ تھے لیکن جانے کہاں کہاں کی اور کتنے دنوں کی گرد نے انہیں آپس میں جکڑ دیا تھا۔ کوئی گچھا اِس طرف ہے تو کوئی دوسری طرف لٹک رہا ہے۔ اُس نے گلابی رنگ کی سستی سی بش شرٹ پہن رکھی تھی جس کے اُوپر کے دو تین بٹن غائب تھے اور کالر چِر کے اُس کی ناک جتنے لمبے ہو رہے تھے۔ نیچے سلیپنگ سوٹ کا پاجامہ تھا جس پر مٹی اور سفید نیلی دھاریاں تھیں۔ وہ بھی ایسی کہ سفید تو اپنا رنگ بالکل ہی بدل چکی تھیں۔ ہاتھ بالکل سیاہ تھے اور ناخنوں کے اندر میل اور باہر نکوٹین کے نشان۔ پاؤں میں سلیپر تھے۔ سلیپر بھی ایسے جو بوٹ کاٹ کے بنائے گئے تھے اور بوٹ بھی جیسے کسی نمازی کے اُٹھا لئے گئے ہوں۔ پنجہ چھوڑ کے باقی حصّہ بلیڈ کے ساتھ کاٹنے کے باوجود پاؤں پھنس گئے تھے اور کناروں پر اچھا خاصا گوشت اُبھرا دکھائی دے رہا تھا۔ ٹخنوں سے ذرا ادھر زخموں کے پرانے نشان تھے جو اکثر زیادہ چلنے اور تنگ بوٹ پہننے کی وجہ سے بن جاتے ہیں۔ سچ تو مجھے اِس حُلیے سے سخت نفرت ہو رہی تھی۔ جھلّایا بھی لیکن اب اُس بدبخت جعفری سے کیا کہتا۔

جعفری صاحب۔ اِس کتاب کا عنوان غلط ہے۔ مذاہب اسلام کیا ہوا۔ مذہبِ اسلام ہو تو بات بنتی ہے ـــ یقین کیجیے

ایک مدت سے اِس کی تلاش میں تھا۔ لیکن ہاتھ آئی تو آج۔ لے جاؤں نا میں اِسے "۔۔۔۔ اُس کی گفتگو بڑی عجیب لگی۔ ظاہری حالت تو گنواروں سے بھی گئی گزری تھی اور پڑھنا چاہتا تھا مذہبی کتاب، پھر بھی مَیں نے اُس سے بات نہ کی۔ چھوڑو جی۔ بھلا یہ بھی کوئی آدمی ہے، بھلے مانس نے شیو کی ہوتی اور اچھے کپڑے پہنے ہوتے اور جعفری سے کہا ہوتا "ذرا وہ آئیڈیل میرج تو نکال دینا۔۔۔۔" تو مَیں نے اُسے گلے لگا لیا ہوتا۔ یہ اب کون بات کرنے کی زحمت گوارا کرتا۔

بارش رُک گئی تھی اور داؤد کتاب بغل میں دابے جانے کے لیئے اُٹھا ہی تھا کہ جعفری نے اُس کی آستین پکڑ لی۔ "بیٹھئے حضرت۔ چائے پی کے جائیے۔۔۔۔" میرا خون کھول گیا۔ یہ جعفری بھی عجیب آدمی ہے۔ ابھی اس سے جان پہچان نہیں اور حضرت چائے کے لیئے مدعو کر رہے ہیں۔ پھر میرے پاس تو فقط آٹھ آنے ہیں اور تین ہونے کی صورت میں تو آنے سے کم کہاں بات بنتی تھی۔ جعفری نے جلدی جلدی الماریاں بند کیں۔ کارڈ بکس میں رکھے۔ مُہریں سنبھالیں، ہمیں لیا اور لائبریری کا دروازہ بند کر کے ہم کیفے کی طرف ہو لیئے۔ لیکن مَیں اندر ہی اندر کُڑھتا جا رہا تھا۔ داؤد اتنی کھسیانی ہنسی ہنسا تھا جیسے یہ چائے نہ ملتی تو وہ مر جاتا۔ ویسے اُس کی گلابی بُش شرٹ کی دونوں جیبیں خالی تھیں۔ آگے پیچھے چُپ چاپ چلتے ہم کیفے میں آئے تو سب کے آگے داؤد تھا۔ مَیں نے جعفری کا بازو کھینچ کے زہر اُس کے کان میں اُگل ہی دیا۔

"عجب احمق ہو یار تم بھی کس گدھے کو ساتھ لے آئے ہو۔ کاش! یہاں کتوں کا داخلہ بند ہوتا"۔۔۔۔ جعفری نے جیسے اُس کی وکالت کی۔

"نہیں عثمان۔ آدمی بڑا شریف اور پڑھا لکھا ہے"۔۔۔۔ اتنی دیر میں ہم بیٹھ چکے تھے اور داؤد نے شریف کا لفظ سُن لیا تھا، خود ہی کہنے لگا۔

"کیا بات ہے جعفری صاحب کی بھی۔۔۔۔ ان جیسا بھلا آدمی کم از کم مَیں نے تو نہیں دیکھا!" اُس کی نگاہوں میں اُنس تھا، عقیدت تھی، محبت تھی اور میرے دل میں۔۔۔۔ کرو اور کرو خوشامد لیکن چائے تو مَیں پلا رہا ہوں اور خوشامد اُس کی کر رہے ہو۔ بہت تیرے کی۔ جانے کس جنگل کا جانور ہے۔ بیٹھنے کی بات تھی کہ داؤد نے اسلامی تاریخ کا ذکر چھیڑ دیا اور مَیں چُپکا چائے کی چُسکیاں لیتا رہا۔

تین چار روز بعد۔۔۔۔ (بعد اس لیئے کہ ان دنوں ہر روز بارش ہو جاتی تھی اور وہ بھی ایسے وقت جب دفتر سے چھٹی ملتی) جب لائبریری گیا تو اُس روز سبھی آئے ہوئے تھے۔ چودھری ایک انگریزی اخبار میں رپورٹر تھا اور اسے تین سو روپے ملتے تھے۔ غالباً وہی ہم سب میں زیادہ پیسے پاتا تھا۔ اور وہی ہمارے لئے سنیما کے فری پاس لایا کرتا تھا۔ جانے اُس ظالم نے کہاں کہاں یاری گانٹھ رکھی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم اُس کی عزت کرتے تھے اور ہمیشہ بڑے احترام سے پیش آتے تھے۔ شریف ایک بینک میں اور شاہ صاحب پوسٹ آفس میں کلرک تھے۔ سب کو بیٹھا دیکھ کے باچھیں کھِل گئیں۔ اور نہیں تو دن بھر کی تھکن تو اُتر

جائے گی نا ــــــ سب کے سب ہنس رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے اور میں بھی داؤد کو جیسے بالکل ہی بھول گیا تھا۔ جیسا کہ رپورٹروں کی عادت ہوتی ہے کہ ایک بار یہ جس میں خبر دے دیتے ہیں تو پھر اُس کی تشہیر کئے بغیر اُن کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ چودھری کوئی تازہ خبر سنا رہا تھا، وہ بھی کسی اغوا کی اور ہم بڑی توجہ سے سُن رہے تھے۔ خبر ختم کر کے چودھری نے میز پہ زور سے ہاتھ مارا اور بولا ــــــ

آج پتہ نہیں، میری جیب میں اتنے پیسے کہاں سے آگئے ہیں۔ چلو سب کو چائے پلاتا ہوں اور پھر ــــــ بہت اچھی فلم آئی ہے۔ صرف بالغوں کے دیکھنے کی ہے۔ پاس لے آیا ہوں، لیکن جلدی کرو نا جعفری، تم میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو ــــــ" جعفری کی بوکھلاہٹ پر سب ہی ہنسی آگئی۔ وہ کارڈ سمیٹنے لگا اور ہم شریف سے ایک اور قصہ سننے لگ گئے۔ دوپہر میں کوئی عورت بینک میں روپے جمع کرانے آئی تھی اور شریف جیسے بے ہوش ہو گیا تھا کہ وہ عورت، عورت کم تھی اور کسی ٹیلر ماسٹر کا اشتہار زیادہ تھی۔ جعفری چابیاں اُٹھا چکا تھا اور ہم قہقہے پر قہقہہ لگاتے ہوئے باہر نکلنے ہی لگے تھے کہ سامنے کی ایک الماری کے عقب سے اپنے اُسی حلیے سمیت ایک کتاب بغل میں دبائے داؤد نکل آیا۔ ہم سب یوں چُپ ہو گئے جیسے داؤد کو نہیں کسی سانپ کو دیکھ لیا ہو۔ اُلجھے اُلجھے سے قدموں سے وہ ہمارے پاس آیا، سلام کیا جس کا جواب ظاہر ہے کسی نے نہ دیا۔ پھر بولا :-

"جعفری صاحب۔ یہ کتاب لے جاؤں ــــــ" جعفری کے چہرے پر سیاہی سی بکھر گئی۔

"لے جائیے، ضرور لے جائیے" اُس نے جاتے ہوئے بھی سلام کیا جس کا پھر کسی نے جواب نہ دیا۔ وہ باہر نکل گیا تو جعفری بڑبڑا اُٹھا۔

"لے جائیے۔ لے جائیے۔ آپ کے باوا کا مال ہے۔ یہ لائبریری اسی کی تو کشتی ہوتی ہے" میں نے چودھری سے پوچھا۔

"چودھری صاحب۔ یہ ہے کون ــــــ؟" چودھری کا بھی موڈ جیسے آف ہو چکا تھا۔

"چھوڑو یار کسی انسان کی بات کرو۔ اس تو بڑے کے متعلق تم کیوں اتنے پارٹی کولر (PARTICULAR) ہو رہے ہو" ہم سب چائے پینے، سینما دیکھنے جا رہے تھے لیکن ہم ہی سے کسی نے بھی اُسے ساتھ چلنے کی دعوت نہ دی۔ لائبریری سے نکل کے ہم جیسے بھول گئے کہ داؤد نام کا بھی کوئی شخص ہمیں ملا تھا۔ کسی کو کیا پڑی ہے جو مفت میں اپنی سُہانی شام ضائع کرے۔

پتہ نہیں انسان اس کا عادی کیوں ہے کہ کسی کو دیکھ کے پہلی ہی نظر میں نفرت کرنے لگتا ہے لیکن اس نفرت کے باوجود میرے دل سے کرید کا جذبہ نہ گیا اور میری حالت کچھ ایسی تھی کہ جب تک داؤد کے متعلق نہ جان لوں گا میرا کھانا ہضم نہ ہوگا۔ دو چار روز تو جعفری اور چودھری ٹالتے رہے۔ وہ بھی صرف وضع داری کے ہاتھوں اُس سے مل لیتے تھے، ورنہ نفرت تو وہ بھی کرتے تھے۔ پر ایک شام جب میں نے چودھری کا پیچھا نہ چھوڑا تو اُسے غصہ آ گیا۔ پرچ میں ڈالی چائے پھر سے پیالی میں انڈیل کے بولے۔

"یار تم سے ایک بار کہا تھا کہ کسی گرہے کی ہسٹری شیٹ سُن لو تو اچھا ہے لیکن داؤد کے متعلق کچھ نہ پوچھو۔ یہ تم نہیں مانتے ــــــ

تم ہی بتاؤ اِس بھاگ دَوڑ میں تو ہر روز ہی کتنے لوگ متعارف ہوتے ہیں۔ اب کون ہر کسی کے پیچھے بھاگتا رہے اور پھر ـــــ" اُن کا لہجہ ذرا کڑوا تھا۔

داؤد کی کہانی ذرا مختصر سی تھی۔ کہ وہ تقسیم کے وقت ہندوستان میں اپنا سب کچھ لُٹا آیا تھا۔ لُٹایا بھی کچھ اِس طرح کہ ایک ایک عزیز کو اپنے سامنے ذبح ہوتے دیکھا۔ پہلے وہ دہلی میں ایک بیٹری بنانے کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ والدین بے حد غریب تھے۔ چوتھی جماعت تک اُس نے پڑھا بھی تھا لیکن اب تو پیٹ بھرنے کو روٹی نہ تھی، اُسے پڑھاتا کون ـــــ لیکن پتوں میں پالو لپیٹنے کے باوجود ذہن کی تشنگی ہمیشہ برقرار رہی۔ کارخانے سے نکل کے وہاں بھی وہ ہمیشہ ہی ایسی لائبریریوں میں بھٹکتا پھرتا کہ جہاں الماریاں بھری ہوتی تھیں لیکن داؤد جیسے لڑکے کو سونگھنے کے لئے بھی نہ مل سکتی تھیں۔ پھر اُس نے ایسے دوست تلاش کر لئے تھے جو محض تفریحاً کبھی کبھی کتاب خرید لیتے تھے لیکن پڑھتے نہ تھے۔ گو کتاب ملتی تو وہاں سے بھی نہ تھی لیکن وہ کم از کم دیکھ تو لیتا تھا، چھو تو سکتا تھا۔ اور نہیں تو دو چار ورق ہی اُلٹ لیتا تھا۔ تقسیم سے پہلے ہی اُسے کارخانے سے چھٹی مل گئی۔ پھر جب وہ اپنے عزیز و اقارب اور والدین کے ساتھ روشن مستقبل کی طرف بڑھا تو یہ رشتے ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑنے لگے جیسے وہ سب کے سب مٹی کے کھلونے ہی تو تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوا تو اُس کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا اور وہ مُنہ اٹھائے حدِ نظر تک پھیلی زمینوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب وہ اکیلا ہے، بالکل تنہا ـــــ

یہاں آ کر اُس نے نوکری کے لئے دَوڑ دھوپ کی۔ اُس کے اندر کا انسان، اندر کی ساری گرمی، سارا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ایک ایسی بے حسی چھائی تھی کہ جو خون کے قطرے قطرے میں پھیل کے اُس کی ہر خواہش اور ہر آرزو کو نگل گئی تھی۔ ویسے دفتر میں نوکری کا سوال یوں پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اُس کے پاس تعلیم تھی ہی کہاں۔ اور جو کام وہ جانتا تھا اب کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں اُس نے ایک کوٹھڑی کرائے پر لے رکھی تھی اور وہیں رہ رہا تھا۔ جانے وہ اُس کا کرایہ کہاں سے ادا کرتا تھا۔ گرمی سردی میں اس کے جسم پر ایک سا ہی لباس دکھائی دیتا تھا۔ کھانے کو مل گیا تو کھا لیا، نہ ملا تو دس دس روز تک فاقہ کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، اس کے گال پچکے ہوئے تھے۔ البتہ وہ لائبریریوں میں جاتا اب بھی تھا۔ اچھی کتاب کو دیکھ کے اُس کی رال اب بھی ٹپک پڑتی تھی۔ اور اگر جعفری اُن دنوں اُن کے کتاب دے دیتا تو اُسے گویا جنت مل جایا کرتی تھی۔

یہ ساری باتیں چودھری نے جیسے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہیں۔ اس لئے کہ وہاں بیٹھے ہوئے اور لوگوں میں سے کسی کو بھی اِن باتوں سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ اب تک جانے کس کس موضوع پر بات کر چکے تھے۔ دو مرتبہ چائے پی چکے تھے اور ہم سے یوں لاتعلق ہو گئے تھے جیسے ہم اس ہوٹل میں موجود ہی نہ ہوں۔ چودھری نے تازہ چائے منگوائی اور پھر سرگوشی کی۔

"لیکن یار۔ تم سُن کے حیران ہو گے کہ وہ تو اچھا خاصا شاعر ہے۔ گو آج تک اُس نے ذکر کبھی نہیں کیا نہ ہی ہمیں کبھی

اپنی کوئی غزل یا نظم سُنائی ہے لیکن ایک بار ——— ہوا یوں کہ میں ایک سٹڈیو میں ایک تقریب کور کرنے گیا کسی فلم کی رسمِ افتتاح تھی۔ سچ جانو، یہ دیکھ کے مارے حیرت کے میری آنکھیں پھٹ گئیں کہ ——— جنہیں یار پہنائے جاتے ہیں مجھے اُن میں ایک داؤد بھی تھا۔ گو اُس کا چہرہ، اُس کی غلاظت، اُس کا لباس سب کچھ وہی تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُس فلم کے تین گیت اُسی نے لکھے تھے اور ان گیتوں کا معاوضہ اُسے صرف بیس روپے ملے تھے۔ اِدھر اُدھر کی افواہوں سے پتہ چلا کہ اُس کا دل چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ یوں بھی یار، اِس سے بڑھ کے اور کون سی چوٹ ہوگی کہ انسان بھرے بازار میں نیلام ہو جائے۔ اِس سے بڑا غم اور دُکھ کیا ہوگا۔" چودھری کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ لیکن میں اب تک تو شاعروں کو ایک بڑی چیز سمجھتا تھا، پر جب پتہ چلا کہ داؤد بھی شاعر ہے، تو مجھے ایک دم اس ساری قوم سے نفرت ہو گئی۔ بیکار، فضول، قوم کے عضوِ معطل ——— اُدھر شاہ جی نے آواز دی۔

"اوئے کیوں اُس کا ذکر مذکر کے اپنے آپ کو پاگل بناتے ہو ———" چودھری کے لہجے کی ہمدردی بھی دھل گئی اور ہم ایک بار پھر اُسنے کوس کے سوچنے لگے کہ کیا ایسا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ داؤد سے جان چھوٹ جاتے۔ پھر ہم نے اپنی اپنی آفس سیکرٹری پر تبصرہ آرائی کی اور بکھر گئے۔

ایک دو دن نہیں پورے دس دن داؤد ہمیں دکھائی نہ دیا تو جیسے ہم نے سُکھ کا سانس لیا۔ ایک، دو بار اُس کا ذکر بھی کیا تھا۔ لیکن یہ ذکر سے زیادہ اظہارِ تشکر تھا۔ جعفری کے منہ سے اگر کبھی کبھار یہ جملہ نکل بھی جاتا ——— "نہیں یارو۔ تم زیادتی کرتے ہو۔ وہ آدمی اچھا تھا ———" تو ہم اُسے اِس بُری طرح چھیڑتے، اتنے طعنے دیتے، داؤد سے اس کی اتنی رشتہ داریاں قائم کرتے کہ بیچارے کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اتنے دنوں تک داؤد نہیں آیا تو ہمیں جیسے اطمینان ہو گیا۔ اطمینان بھی کچھ اِس طرح کا کہ جیسے اپنے ہی گھر میں رکھی کوئی چیز اتنی بُری لگنے لگے کہ آپ تنگ آ کے اُسے باہر پھینک دیں اور پھر بڑے سکون سے بیٹھ جائیں کہ اب وہ شے آپ کو دکھائی نہ دے گی، جو پہلے ذہنی انتشار کا باعث بنتی تھی ———

لیکن ایک روز جو میں لائبریری کے دروازے پر پہنچا ہوں تو داؤد ——— سامنے جعفری کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میرے قدم وہیں رُک گئے۔ جی چاہا واپس چلا جاؤں لیکن پھر سوچا، میں تو جعفری سے ملنے آیا ہوں۔ داؤد سے کیا غرض۔ میں نے اُسے سلام بھی نہ کیا۔ چُپ چاپ جعفری کے پاس بیٹھ گیا۔ جعفری باہر کہہ رہا تھا لیکن اُس کی آواز میں اگر محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی۔ کچھ دیر وہ باتیں کرتے رہے، پھر چُپ ہو گئے۔ داؤد کا حُلیہ ویسا ہی تھا۔ وہی چہرہ، وہی رنگت، وہی گلابی بُش شرٹ، نیلی دھاریوں والا پاجامہ اور پھٹے پھٹے سلیپر ——— کپڑے البتہ دُھلے ہوئے تھے لیکن چہرے کی نحوست ——— بہت دیر انتظار کرنے کے باوجود جب چودھری اور دوسرے دوست نہ پہنچے تو ہم لائبریری بند کر کے ریستوران کی طرف ہو لیے۔ سارے راستے میں ہم نے کوئی بات نہ کی۔ صرف جعفری نے اتنا کہا تھا۔

"چائے بھی کیا چیز ہے، دیکھ کے ہی ساری تھکن نَو دو گیارہ ہو جاتی ہے ———" اس کے بعد پھر ہمارے لبوں پہ

قفل لٹک گئے۔

ریستوران میں جا کے بیٹھے تو باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بیرا آیا تو جعفری نے محض تکلّف کے طور پر داؤد سے پوچھ لیا۔

"چائے پئیں گے نا آپ بھی ——" داؤد ہلکی سی کھسیانی ہنسی ہنسا۔ پھر کہنے لگا۔

"پہلے اگر کھانا منگوا دیں تو اچھا ہے۔ پھر چائے پی لیں گے" —— اُس کی آواز میں مجبوری تھی۔ جعفری نے نہ چاہتے ہوئے بھی کھانے کا آرڈر دیا اور اپنے لیئے چائے منگوالی۔ ہم چائے پیتے رہے اور داؤد کھانا کھاتا رہا۔ کھاتا نہیں تھا پل پڑا تھا۔ اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ نہ جانے وہ کتنے دنوں کا بھوکا ہے لیکن پھر بھی اُس کی بے تکلّفی نے مجھے جیسے کاٹ کھایا تھا۔ مَیں نے اُس سے پوچھا۔

"سُنا ہے آپ فلموں کے لیئے گیت بھی لکھتے ہیں ——؟" میرا لہجہ ایسا تھا جیسے کہنا چاہتا ہوں، سُنا ہے تم جھک بھی مارتے ہو۔ روایتی قسم کی مسکراہٹ لبوں پہ آئی جسے روٹی کے لقمے نے چھین لیا۔ آنکھیں پلیٹ کی سطح پہ گڑائے کہنے لگا۔

"شاعر تو مَیں کہاں ہوں جی —— نہ تعلیم ہے، نہ مشاہدہ، نہ فکر —— ہاں! چند الفاظ جوڑ لیتا ہوں"۔

مَیں نے اصلی بات پوچھی "تو کیا فلم والے آپ کو پیسے نہیں دیتے ——؟" مَیں کہنا بھی یہی چاہتا تھا کہ میاں! جب فلموں سے تمہیں پیسے ملتے ہیں تو ہمارے سر بوجھ کیوں ڈالتے ہو، رُک کے بولا —— "دو چار روز روٹی کھلا دیتے ہیں میرے لیئے یہی کافی ہے، نہ اُنہوں نے کبھی کچھ دیا، نہ مَیں نے مانگا۔ مانگ کے کروں گا کیا۔ مانگوں بھی تو کس کے لیئے۔ تنہا آدمی ہوں۔ اچھی بُری گزر رہی ہے —— پھر پیسے لے کے اُنہیں چاٹنا ہے کیا ——؟" مجھے اُس کی یہ منطق نہایت واہیات لگی۔

اور جب چائے اُس کے سامنے آئی تو جعفری کو دیکھ کے وہ ایک بار پھر کھسیانی ہنسی ہنسا —— "جعفری صاحب! کھانا تو آپ نے کھلا دیا۔ اگر بگلے کا ایک سگریٹ بھی منگوا دیں تو ——" جعفری کا لہجہ بڑا درشت تھا۔ "میرے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں۔" داؤد پھر ہنس دیا "کوئی بات نہیں۔" جعفری کا تو اُس ریستوران میں حساب چلتا تھا، میری جیب میں البتہ پیسے ضرور تھے لیکن کون اب دو پیسے حرام کرتا، مَیں بھی چُپکا بیٹھا رہا —— داؤد نے ایک گھونٹ بھر کے پھر جعفری سے کہا۔

"مان گیا ہوں آپ کو تو۔ جعفری صاحب۔ کس سادگی اور بے تکلفی سے کہا ہے کہ میری جیب میں تو ایک پیسہ بھی نہیں۔ واہ واہ۔ سُبحان اللہ ——" اُس کے لہجے میں محبت تھی، جعفری بولا نہیں۔ لیکن مَیں اندر ہی اندر کھول اُٹھا۔ کرو خوشامد۔ شاباش بیٹے کرو خوشامد۔ ہمت تیرے کی —— جعفری کا موڈ تو ظاہر ہے، آف ہونا ہی تھا کہ بیچارے کے سر مفت کے کھانے کے پیسے آ گئے تھے۔ سو وہی موڈ لیئے وہ اُٹھا اور بات کیئے بغیر گھر چلا گیا۔ مَیں نے داؤد سے بات تک نہ کی۔ سلام

تک نہ کیا اور سائیکل پر بیٹھ کے گھر کی طرف ہو لیا۔

اگلے روز ہم سب لائبریری میں اکٹھے تھے۔ میں نے سارا قصہ دوسروں کو سنا دیا تھا۔ قصہ کیا سنا دیا تھا، اچھا خاصا افسانہ گھڑ لیا تھا۔ دوسروں نے بھی نمک مرچ لگا کے جو جعفری کو تنگ کیا تو وہ جیسے چلا اٹھا۔

"بس کرو یار، میرے تو باپ کی بھی توبہ جو اس کو پھر منہ لگا جاؤں ——" ہم سب بے حد خوش ہوئے، خوب ہنسے۔

اُس شام چودھری نے ہمیں چائے۔ فلم دکھائی اور پھر بچھڑنے سے پہلے ہم نے طے کر لیا کہ اگر اگلے روز داؤد لائبریری میں آئے تو اُسے جوتے مار کے وہاں سے نکال دیا جائے۔ بڑا شاعر بنا پھرتا ہے۔ جیب میں کھانے کو نہیں اور اکڑ ہمیں دکھاتا ہے، ہونہہ ——

لیکن دوسرے روز ہم سب بہت دیر تک منہ لٹکائے بیٹھے رہے، انتظار کرتے رہے لیکن داؤد نہ آیا۔ دوسرے روز بھی کیا، وہ تو پورے دو ماہ سے غائب تھا۔ جیسے وہ لائبریری کا راستہ ہی بھول گیا ہو۔ ہم نے بھی اُسے بھلا دیا، وہ یاد رکھنے کی چیز تھا ہی کب، جو اُسے یاد رکھا جاتا ——

اب تو ہمارا اپنا ملنا جلنا بھی کم ہو چلا تھا۔ شریف کی تبدیلی ہو گئی تھی اور وہ چلا گیا تھا۔ شاہ صاحب کو جانے کیا ہوا کہ ایک دم تسبیح سنبھال کے مصلے پر بیٹھ گئے اور چودھری کو دنیا کے بکھیڑوں نے اُلجھا دیا۔ ایک بار آیا بھی تو سخت متفکر تھا۔ اُس کے بڑے بیٹے کی شادی ہو رہی تھی، اُسی کے انتظام میں بے چارہ دن رات بھاگتا رہتا تھا۔ بس لے دے کے جعفری اور میں ہی رہ گئے تھے، جو کم و بیش روز مل لیتے تھے۔ جعفری کی تنخواہ بڑی قلیل تھی، کھانے والا اچھا خاصا خاندان تھا، لیکن اس کے باوجود ہر روز شام جب تک ریستوران میں چائے نہ پیتا، اُسے آرام نہ ملتا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے جایا پیئے جاتے تھے۔ کوئی دو ماہ گزر گئے۔ ان مہینوں میں نہ تو چودھری دکھائی دیئے اور نہ ہی داؤد کی خبر ملی۔ ایک روز تو میں نے جعفری سے پوچھ ہی لیا۔

"اس کا سُراغ لگانا چاہیئے کہ چودھری نے شادی بیٹے کی رچائی ہے یا اپنی، جو وہ سرے سے غائب ہی ہو گیا ہے۔"

دوسرے ہی روز جب ہم لائبریری سے اُٹھنے لگے تو چودھری اچانک چلا آیا۔ جعفری نے تو دیکھتے ہی جیسے نعرہ لگایا۔

"بڑی عمر ہے آپ کی بھی چودھری صاحب، ابھی کل ہی آپ کو یاد کر رہے تھے۔" چودھری نے بیٹھ کے سگریٹ سلگایا اور پھر سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا۔ وہ خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی، کپڑے بھی میلے تھے اور ہونٹ خلافِ معمول بھنچے ہوئے تھے۔ ہم اُٹھے اور ریستوران کو ہو لئے۔ راستے میں پوچھا "کیا بات ہے چودھری صاحب۔ آپ راستہ بھولے بھی ہیں تو اتنے پریشان اور کھوئے ہوئے ہیں کہ ——"

میز کے گرد بیٹھ کے چودھری بڑے دُکھ سے بولا۔

"کیا کہوں یار۔ زندگی کے دُکھ بڑے عجیب ہیں۔ ایک ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا گردن دبوچ لیتا ہے۔ بیٹے کی شادی میں اسی لیے ٹالتا آرہا تھا کہ تھوڑا کر کے ہم کچھ بنالیں گے۔ آخر بیٹے کی شادی تھی۔ ابھی کچھ ہوا تھا اور کچھ نہیں ہوا تھا کہ لڑکی والوں نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ شادی نہیں کرتے تو رشتہ کسی اور جگہ دے دیں گے۔ اب یار ——" چودھری نے جھک کے جام کا گھونٹ بھرا اور پھر چُپ ہو گیا۔ مریض سے نہ کونین کی گولی نگلی جاتی تھی نہ بے چارہ تھوک سکتا تھا۔ چودھری نہ کہہ سکتا تھا اور نہ ہی چُپ رہ سکتا تھا ——

"اب یار —— اور تیاری تو میں نے کر لی ہے لیکن شام بارات جائے گی۔ اور میری جیب میں ایک پیسہ تک نہیں ——" چودھری نے بڑے دُکھ سے آنکھیں بند کر کے سگریٹ کا کش لیا اور دُھواں یوں اُگلا جیسے سینے کا سارا درد اُگل رہا ہو۔ جعفری نے زمانے کے تھپیڑے کچھ زیادہ ہی کھائے تھے، اُس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں، کانپتی آواز میں بولا۔

"چودھری صاحب قسم خدا کی، گھر کا خرچ اُدھار چل رہا ہے۔ میرے پاس اگر دس روپے بھی ہوتے تو میں حاضر کر دیتا —— کاش! میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا ——" میں نے اپنے دل کو کُریدا۔ میرے پاس چھ سَو روپے تھے تو، لیکن سردیاں آرہی تھیں۔ سُوٹ بنوانا تھے، کئی دوسری چیزیں خریدنا تھیں۔ چودھری کو دے کے لیتا رکس سے۔ میں نے بھی رسمی سے دو چار فقرے کہہ کر اپنی معذوری کا اظہار کر ڈالا۔

"نہیں بھائی۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔ جانتا ہوں سب کے حالات ایک جیسے ہیں۔ پھر دس بیس سے کام بھی تو نہیں چلتا۔" تھوڑی دیر ہم تینوں سر جُھکا کے بیٹھے رہے۔ بقیہ چائے وہیں ٹھنڈی ہو گئی۔ جو پی تھی اُس کا لطف بھی کرکرا ہو گیا تھا۔ پھر چودھری اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو یار۔ ایک سیٹھ کے پاس چلتے ہیں۔ کسی زمانے میں میں نے اُس کی بڑی مدد کی تھی۔" ہم اُٹھ کے باہر نکل آئے۔ چودھری کہہ رہا تھا۔

"جس زمانے میں الیکشن تھے۔ میں نے اخبار کے ذریعے اُسے خوب اُچھالا تھا۔ میرے سہارے ہی تو وہ جیسا تھا۔

گلیاں ناپتے، سڑکیں طے کرتے ہم شہر کے نسبتاً تنگ اور تاریک علاقے میں جا نکلے۔ چودھری نے ایک تین منزلہ مکان کے سامنے رُک کے کال بیل پہ ہاتھ رکھا اور دوسرے لمحے ہم سیٹھ صاحب کے سامنے تھے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے چودھری کا استقبال کیا۔ فوراً نوکر کو بُلا کے چائے کا کہا اور جب کسی قدر گھٹی آواز میں چودھری نے بات کہی تو سیٹھ صاحب بولے۔

"یار چودھری سچی بات ہے، تم سے بڑھ کے اور کون سی شے پیاری ہو سکتی ہے اور پھر تمہارے تو میرے اوپر احسان بھی ہیں۔ لیکن یار! اس کاروبار کا کیا کہوں۔ ان دنوں تو یوں سمجھو کہ بالکل ہی ٹھپ ہے۔ خرچ ہی خرچ ہے اور آمدن نام کی نہیں۔ یار! تم کہو گے ——— بھئی! اگر دو چار روز تک پھر آؤ تو امید ہو سکتی ہے، اس وقت تو مجھے معذور سمجھو۔" ہمیں یقین تھا کہ چودھری اگر ایک بار بھی اور کہتا تو کام بن سکتا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ ایک مرتبہ بھی اس نے کتنی مشکل سے چند الفاظ کہے تھے۔ جیسے اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا ہو۔

اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا کہ ہم اٹھیں اور چپ چاپ باہر نکل آئیں۔ ہم باہر چلے تو آئے پر مسئلہ وہیں تھا کہ پیسے کہاں سے لیں۔ لیکن تین منزلوں والے شاندار ڈرائنگ روم کے مالک سیٹھ کی بڑھ چڑھ کے تعریفیں کرنے لگے۔ وقتی طور پر جیسے بالکل بھول گئے کہ ہماری پریشانی کونسی ہے۔ آخری گلی رہ گئی تھی اور موڑ کاٹ کے ہمیں سڑک پہ پہنچ جانا تھا۔ چودھری کہہ رہا تھا۔

"ایسے خدا ترس اور نیک لوگ روز روز تھوڑی ہی ملتے ہیں، یہ تو ———" پر منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی کہ ہم گلی میں داخل ہو چکے تھے اور اب اس بیٹھک کے سامنے کھڑے تھے کہ جس کے دروازے میں چوکھٹ کا سہارا لیئے داؤد کھڑا تھا۔ ہم حیران ہی تو رہ گئے۔ بیٹھک خالی خالی لگ رہی تھی۔ داؤد نے ہمیں دیکھا تو کود کے گلی میں آگیا اور ہم سے ہاتھ ملانے کے بعد جعفری سے تو وہ جیسے بغل گیر ہو گیا۔ گلی میں گو بجلی کی روشنی آ رہی تھی لیکن اس کا سیاہ چہرہ بالکل دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بازو سے پکڑے، گھسیٹتے ہوئے وہ جعفری کو بیٹھک میں لے گیا اور ہم بھی اندر چلے گئے۔ میں نے سوچا، دیکھیں تو سہی، رہتا کہاں ہے۔

چھوٹی سی بیٹھک تھی۔ جس میں ایک بڑا میز پڑا تھا۔ میز پر دو اینٹیں اور ایک چادر پڑی تھی اور بس ——— اس کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ کوئی کپڑا، جوتا، برتن کچھ بھی نہ تھا۔ چادر وہ شاید سوتے ہوئے اوپر لیتا تھا اور میز پہ ہی سوتا تھا۔ روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو مجھے دیکھ کے بڑی حیرانی ہوئی۔ تازہ شیو بنی ہوئی تھی۔ ہمیں میز پہ بٹھا کے وہ خود دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پہ ہمارے لیئے عزت تھی، احترام تھا، خوشی تھی اور لجاجت بھی ——— بڑے عاجزانہ انداز میں بولا۔

"میں کیا خدمت کروں آپ کی۔ دیکھئے نا، یہ جگہ بھی کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے۔ چلئے، ہوٹل میں چل کے بیٹھتے ہیں۔" لیکن چودھری نے فوراً روک دیا۔

"نہیں بھئی۔ اس کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک کام سے آئے تھے۔ اب چلیں گے ———"

جب تک ہم گلیوں میں چلتے رہے، سیٹھ کی تعریفیں کرتے رہے۔ تاکہ چودھری کا خیال بٹا رہے لیکن اب پھر بے چارگی اس کے چہرے پہ تھی۔ داؤد کی نگاہیں پھر جھک گئیں "معاف کیجئے گا۔ یہ جگہ یقیناً آپ کے بیٹھنے کے لائق

نہیں پر ——— آپ کیا کسی خاص کام سے آئے تھے ؟ ویسے آپ پریشان سے لگ رہے ہیں" ——— چودھری نہ جانے کیا جواب دیتا مگر جعفری سے صبر نہ ہو سکا۔ گو وہ پیٹ کا ہلکا نہ تھا مگر چودھری کی پریشانی نہ دیکھ سکا۔

"بس ذرا سیٹھ کریم بخش کے پاس آئے تھے۔ چودھری صاحب کو کچھ روپوں کی ضرورت تھی ———" داؤد دیوار کا سہارا چھوڑ کے بڑی فکر سے بولا۔

"اچھا ——— یہ کام تھا آپ کو ———" اور چودھری کو وہ سب کچھ ایک بار پھر کہنا پڑا جو وہ کسی صورت میں نہیں کہنا چاہتا تھا۔ ڈوبتا تنکے کا سہارا بھی تو لے لیتا ہے۔

"ہاں بھئی داؤد ستم ظریفی دیکھو۔ کل بیٹے کی شادی ہے اور باپ کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ———" ایک ٹھنڈی سانس بھر کے چودھری اُٹھ کھڑا ہوا کہ اب چلتے ہیں۔ داؤد نے پھر دیوار کا سہارا لے لیا۔ اس کے چہرے سے شکوہ سا برس رہا تھا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں چودھری صاحب ——— ذرا سی بات پر اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ مجھے آج ہی زندگی میں پہلی بار چار سو روپے آٹھ گیتوں کا معاوضہ ملا ہے۔ ان سے کام چل جائے گا آپ کا ———؟" ہم میز سے اُتر چکے تھے۔ داؤد نے آگے بڑھ کے اینٹ اُٹھائی، نیچے کافی سارے نوٹ رکھے تھے۔ اُٹھا کے اُس نے چودھری کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ہمیں جیسے کسی نے اُٹھا کے پھر میز پر سر کے بل دے پٹخا ہو ——— داؤد کہنے لگا۔

"معاف کیجئے، دو روپے کم ہیں۔ میں نے عیاشی کی ہے ان سے ——— پر ——— کام چل جائے گا نا آپ کا ———؟"

ہم تینوں گنگ تھے۔ اُسے جواب بھی نہ دے سکے۔ چودھری نے صرف اتنا کہا ——— "نہیں نہیں داؤد۔ تمہارے کام آئیں گے ——— تم ———"

بات کاٹ کے وہ ہنس دیا۔ "میں انہیں کیا کروں گا جی ——— میرے کس کام آئیں گے۔ میں تو اکیلا، تنہا ہوں میرے کس کام کے یہ ——— کل برات میں آؤں نا میں بھی ؟" ہم اُس سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکے۔

سڑک پر سر جھکا کے چلتے ہوئے چودھری اور جعفری جانے کیا سوچ رہے تھے۔ پر میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت کون سی گالی دوں داؤد کو ———!

● ——— "تجربہ غلطیوں کے اعتراف کا نام ہے۔"

(آسکر وائیلڈ)

ابنِ قاضی

شادی کے نام

(سب کچھ لکھ دینے کی معذرت کے ساتھ)

پیارے شادی!

خدا تمہیں سلامت و خوش رکھے

آج میں تمہاری خدمت میں خط لکھ رہا ہوں! شاید تم پڑھ نہ سکو۔ لیکن لکھنے میں کیا حرج ہے؟ ہو سکے تو گل خان سے پڑھوا کر سُن لو۔ کہ سُن بھی نہ سکو گے؟

شادی! آج، کل یا پرسوں بالآخر ایک دن ہم تم جُدا ہو جائیں گے۔ ہم اپنی اپنی تعلیم کا کچھ حصہ مکمل کر کے کسی اور جگہ انتقال کر جائیں گے۔ اِس کالج سے، ان کمروں، دروازوں، کھڑکیوں، روشندانوں، برآمدوں اور نوٹس بورڈوں سے دُور چلے جائیں گے۔ تمام لیکچرار حضرات اور پروفیسر صاحبان سے بھی دُور چلے جائیں گے۔ مگر یہ جُدائی ایک وقت کے لئے عارضی ہو گی۔ ہم کبھی کبھار کسی چھٹی یا فارغ اوقات میں ضرور تمہاری زیارت کے لئے آتے رہیں گے ـــــ ہمیں پہچان لو گے نا؟

آخر ایک دن آئے گا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی منزلِ مقصود کو پا چکا ہو گا۔ کوئی افسر بن چکا ہو گا، کوئی ڈاکٹر یا انجینئر بن جائے گا تو کوئی تاجر بن جائے گا اور یا پھر کوئی پروفیسر یا لیکچرار کے رُوپ میں تمہارے پاس آجائے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارے طلباء کا کوئی سا مقام بھی تیرے خیال اور یاد کی راہ میں حائل نہ ہو گا ـــــ تمہارا حُسن بھلا بُھلا دینے کی چیز ہے؟ ہم منتشر ہو جائیں گے لیکن تجھے یاد رکھنے میں مشترک ہوں گے ـــــ تیری یاد ہماری آنکھوں کے سامنے کالج کا پُرانا زمانہ پھیر لائے گی۔ تمہاری دلچسپیاں اور ہمدردیاں کبھی نہ بُھولیں گی!!

فارغ وقت میں جب ہم نوٹس بورڈ کے پاس آتے اور تم سے پوچھتے ہیں کہ شادی گھنٹی کب بجے گی تو تم ایک بھرپور مسکراہٹ سے کہتے ہو "مجھے وقت دیکھنا نہیں آتا"! حالانکہ ہمیں یقین ہے کہ تم "وقت کو" دیکھ سکتے ہو۔ کیونکہ ہم جب پانچ منٹ آگے یا پیچھے وقت بتاتے تو تم فوراً اپنی دُھوپ گھڑی کا اندازہ کر کے ہمیں ہماری غلطی کا احساس دلا دیتے ہو۔ ہم اِس وقت کو کیسے بھُول سکیں گے!

شادی! تم میں معاشرے کی خدمت کا بے پناہ جذبہ ہے کیونکہ تم کالج میں۔ جس لڑکے کو بغیر گاؤن کے دیکھتے اُسے

یونیفارم کی پابندی کرنے کی ہدایت کرتے۔ دھاری دار پاجامہ، یا ہوائی چپل میں کسی لڑکے کا دیدار ہوتا ہے تو تم اسے ایسے ایسے خطابات و القابات سے نوازتے ہو کہ وہ حیرت و پریشانی کی تصویر بن جاتا ہے۔ اور پھر تم بھی کچھ ایسے انداز سے اُسے مناتے ہو کہ وہ سب کچھ بھول جاتا ہے ——— حتیٰ کہ تمہیں بھی۔ لیکن وقت آئے گا جب ہم میں سے ہر ایک سالوں بعد تمہارے لئے اور صرف تمہارے لئے اِس کالج میں آجایا کرے گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلتے جائیں گے لیکچرار اور پروفیسر ریٹائر ہو جائیں گے یا کسی اور جگہ ملازمت کر لیں گے، اِسی طرح دیگر ملازمین بھی۔ مگر صرف تم ہی ایک ایسی ہستی ہو جس سے ریٹائرمنٹ دُور بھاگتی ہے۔ اسی لئے بس تمہارا ہی ایک ایسا وجود ہے جو اِس کالج میں دائمی ہے اور جو ہمارے شعورِ لاشعور اور تحت الشعور کے لئے بھی دائمی ہی رہے گا۔ وہ وقت بھی آئے گا کہ جب ہم کالج کے دو چار پُرانے دوست مِلا کریں گے، بات چیت میں جب کالج کا ذکر آئے گا تو لازماً تمہارا تذکرہ بھی ہو گا۔ شادی! تم کالج کا ایک لازمی جزو ہو جس کے بغیر یہ داستان نامکمل اور پھیکی رہے گی۔ اُس وقت ہم تم کو اِس کالج کا وزیرِ اعظم کہا کریں گے۔ مگر شادی! تم خیال کرتے تو ضرور ہو گے کہ مَیں وزیرِ اعظم کیسے ہوں۔ شادی تم یقیناً ویسے ہی وزیرِ اعظم ہو جس طرح پُرانی بادشاہی حکومتوں کے وزیر ہوا کرتے تھے۔ تمہارے حکم سے ہر ایک کو ڈر لگتا ہے۔ تمہاری شخصیت کا ہر ایک معتقد ہے۔ تم ہر وقت عالی جناب پرنسپل صاحب کے نئے نئے احکامات ہم تک پہنچاتے ہو۔ اسی وجہ سے تم وزیرِ اعظم نہیں تو اور کیا ہو؟

شادی! تمہاری سادگی اور بے تکلفی کا رعب بھی کچھ کم نہیں لیکن ہمیں وہ وقت یاد ہے گا جب تم کسی پروفیسر یا طالبعلم کا گاؤن زیبِ تن کر کے چپکے سے ہماری کلاس میں چلے آتے ہو۔ مَیلی سی دھوتی کے اوپر چمکدار ریشمی گاؤن۔ یہ تضاد اور عجیب نظارہ دیکھ کر طالبعلم بے اختیار زور سے قہقہہ لگاتے ہیں اور تم ایک خاص انداز سے سر جھٹک کر باہر چلے جاتے ہو ——— حالانکہ تم نہ بھی جاؤ تو کوئی فرق نہیں پڑتا!!

کالج سے تمہاری وفاداری کبھی بُھلائی نہ جا سکے گی۔ تم ہر چیز کی اِس طرح حفاظت کرتے ہو جیسے یہ تمہارے گھر کا اثاثہ ہو۔ اور حقیقت بھی کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ تم کالج سے اوّل تو کہیں جاتے ہی نہیں اور اگر جاتے ہو تو پھر بھی شاید نہیں جاتے۔ تمہارے بغیر کالج کی فضا بے لطف اور بے کیف معلوم ہوتی ہے۔ دن ہو یا رات کالج کے برآمدوں میں تمہاری کھنک دار آواز گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہے اور تمہارے کُتّوں کی آواز بھی!!

شادی! تم ایک دائمی یاد ہو، یا رسمی عبادت گھر کی اُس سُلگتی ہوئی چنگاری کی مانند جو ہمیشہ سُلگتی رہتی ہے ——— تمہاری یاد بھی ہمارے دلوں میں اِس چنگاری کی طرح سُلگتی رہے گی ———!

ہاں شادی! ایک بات پوچھوں۔ شرماتو نہ جاؤ گے؟ ——— اچھا یہ بتاؤ تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟

نیک تمناؤں کے ساتھ

تمہارا پرستار:-

ابنِ قاضی

نقد و نظر

"خلا کی تسخیر"

مصنف :- پروفیسر حبیب اللہ خان ایم-ایس سی-

ناشر :- مجلس ترقیٔ ادب لاہور-

پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب کی شخصیت تعلیم الاسلام کالج کے طلباء کے لیے کسی تعارف کی محتاج نہیں- خانِ موصوف علی برادران کے اُس خانوادہ کے مایۂ ناز فرزند ہیں جس کی علمی و ادبی خدمات کا سارا برِصغیر ہندو پاک معترف ہے-

زیرِ نظر کتاب اُردو زبان میں سائنسی علوم کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ ہے- اُردو زبان میں سائنسی موضوعات پر بہت کم لکھا گیا ہے- اکثر لوگ اُردو میں لکھتے ہوئے صرف اسلئے گھبراتے ہیں کہ کہیں اُردو کو قومی و تدریسی زبان نہ قرار دے دیا جائے- خان صاحب کی یہ کوشش اس لئے بھی قابلِ صد ستائش ہے کہ انہوں نے وہ مواد فراہم کیا ہے جو شاید ہی کسی اور ذریعہ سے ہمیں میسر آسکے-

'خلا کی تسخیر' انیس کتابوں کا نچوڑ ہے- اِس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے غیر معمولی تحقیق، تلاش، تجسس اور کاوش سے کام لیا ہے-

زبان سادہ اور رواں ہے- جابجا سادہ اشکال اور جدولوں کے ذریعے مطالب کو آسان، واضح تر، معلومات افزا اور دلچسپ بنایا گیا ہے-

وہ اسباب جو اِس کتاب کی تصنیف کا باعث بنے- یہ ہیں :-

"آج کا نوجوان ایسے ماحول میں پرورش پاتا ہے، جہاں ایٹمی توانائی، ٹیلی ویژن، راکٹ، اور میزائل، خلائی جہاز اور شمس و قمر کی جانب سفر کا ہر وقت چرچا رہتا ہے- اِس کا شعور اس قدر بیدار ہو چکا ہے کہ بجائے حیرت اور استعجاب کا اظہار کرنے کے وہ ان مسائل میں گہری دلچسپی لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی معلومات میں مزید اضافہ ہو- جب وہ روس کے سپٹنک اور امریکہ کے مصنوعی سیاروں کا حال پڑھتا یا سنتا ہے، تو کئی سوال اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں- وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کیا چاند تک انسان پہنچ سکتا ہے؟ کیا خلا میں سفر ممکن ہے؟ کیا مصنوعی سیاروں میں قیام ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو وہاں بقائے زندگی کے کیا

سامان کرنے ہوں گے ؟ خلائی سفر کا انسان کے جسم پر کیا اثر ہوگا ؟ شہابِ ثاقب اور کائناتی شعاعوں سے کیونکر محفوظ رہا جائے گا ؟ یہ اور اِس قسم کے بیسیوں سوالات ہیں، جو آج ہر نوجوان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر اِن کا جواب معلوم کرنے کے لئے اُردو زبان میں سرِدست بہت کم لٹریچر موجود ہے۔ اِس تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ خلا کی تسخیر کے بارے میں مستند معلومات عام فہم انداز میں اپنی زبان میں پیش کی جائیں، تاکہ کسی حد تک اِس جذبے کی تسکین ہو سکے۔"

مصنّف نے جابجا سائنسی اصطلاحات کا عام فہم زبان میں ترجمہ کر دیا ہے۔ مگر ساتھ ہی انگریزی اصطلاحات بھی درج کر دی ہیں۔ تاکہ کسی کو بھی سمجھنے میں دقّت نہ ہو۔

کتاب اگرچہ خالصتہً سائنسی موضوع پر لکھی گئی ہے مگر جابجا ادبی چاشنی بھی ملتی ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے :-

"خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی ہے اور اٹامک انرجی کمیشن نے بھی ایٹمی توانائی اور راکٹوں کے استعمال کی طرف توجہ کی ہے۔ تادمِ تحریر دو موسمی راکٹ راہ پر اوّل، دوم چھوڑے جا چکے ہیں اور تیسرا آئندہ موسم سرما میں چھوڑنے کی تجویز ہے۔ اسی طرح مصر میں بھی راکٹ سازی کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ یہ حرکت بہت خوش آئند ہے۔ اگرچہ ہمارے مُلک میں آغاز ایسے راکٹوں سے ہو رہا ہے جو غیر ملکی ساخت کے ہیں لیکن اِس میں کچھ حرج نہیں۔ ابتداء ہمیشہ اِسی طرح ہی ہوتی ہے۔ نئے دَور میں خود امریکہ نے اور غالباً روس نے بھی اپنی کارروائیوں کا آغاز جرمن ساخت کے وی ٹو راکٹوں سے کیا تھا۔ توقع ہے کہ آج کا بویا ہوا بیج کل تناور درخت بن جائے گا اور اس میں انشاء اللہ بہت سے پھل پھول اور نئے شگوفے لگ جائیں گے۔ جو تجربہ غیر ملکی راکٹوں کے استعمال سے حاصل کیا جائے گا اس کی روشنی میں ایک نہ ایک دن ہم اپنے ملک میں بھی راکٹ بنانے کے قابل ہو جائیں گے۔"

کتاب کے معیاری ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسے مجلسِ ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔

(ش۔ع۔س)

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے،
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

(غالب)

بسفر رفقت مبارک باد

تعلیم الاسلام کالج کے دو معزز اساتذہ جناب ڈاکٹر سید سلطان محمود صاحب شاہد اور پروفیسر ظفر احمد صاحب وفیس اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انگلینڈ تشریف لے گئے ہیں۔ شاہد صاحب موصوف تین سال قبل کیمسٹری میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے واپس آئے تھے اب پھر مزید ریسرچ کے لئے سدھارے ہیں۔ ظفر صاحب اقتصادیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی فرمائیں گے۔ ادارہ المنار ہر دو صاحبان کے لئے دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے بلند تر مقاصد میں کامیاب فرمائے اور وہ بامیلِ مرام واپس تشریف لائیں۔

جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ ان صاحبان کو اسٹاف کی طرف سے چائے کی الوداعی پارٹی دی گئی تو اسٹاف کے ایک رکن نے محترم شاہد صاحب کی خدمت میں جو منظوم الوداعی سپاسنامہ پیش کرنے کے لئے لکھا (اور جو بروقت سنایا نہ جا سکا) اس کے چند شعر ہدیۂ قارئین ہیں ——

ہجر کے اور بڑھ گئے گھاؤ
وصل کا آج چڑھ گیا بھاؤ!
جنکی دعوت ہوئی "قسم" سب پر!
ان کی دعوت ہے نوش فرماؤ
ہیں شریکِ سفر ظفر صاحب!
کامیابی ہے گویا "بے بھاؤ"
مَیں نے جب یہ سخن کہا ان سے
"شاہ صاحب" کو آگیا تاؤ!
سُن کے فرمایا صرف اتنا کہو
"خیر سے آؤ، خیر سے جاؤ!"

بسفر رفقت مبارک باد

اب سلامت رہو تو "باز آؤ"

AL-MANAR

OCT., NOV., DEC.

1963

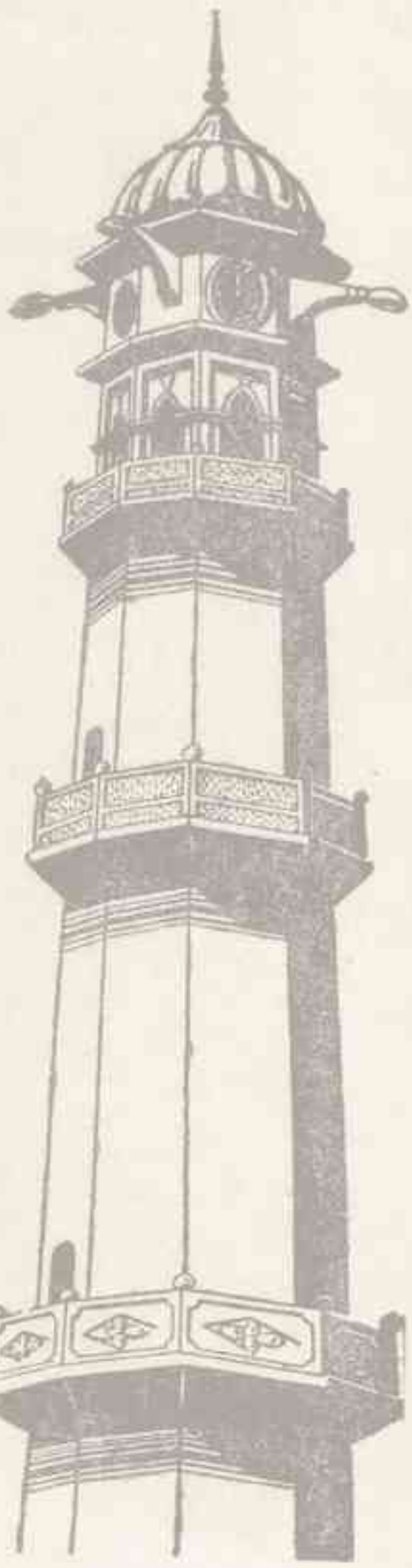

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE

ة لوا لمن يقتل فى سبيل الله اموات
ا حياء و لكن لاتشعرون ٥ ولنبلونكم
بشئ من الخوف و الجوع و نقص من
ا ل و الانفس و الثمرات و بشر
اله ابرين ٥ الذين اذا اصابتهم مصيبة
قالوا انا لله و انا اليه راجعون ٥

"And say not of those who are killed in the cause of Allah that they are dead; nay, they are living; only you perceive not: And we will try you with something of fear and hunger, and loss of wealth and lives, and fruits; but give glad tidings to the patient; Who, when a misfortune overtakes them, say, 'Surely to Allah we belong and to Him shall we return."

CONTENTS

1. Editorial ... 1
2. A Key to Success ... 6
3. The Real Object ... 7
4. A Great Soul Passes Away ... 9
   Prof. Habib Ullah Khan M.Sc.
5. Pursuit of Knowledge ... 13
6. The Salt of the Earth ... 15
   Prof. Malik Muhammad Abdullah
7. My Reminiscences ... 18
   Parvez C. Hossen
8. Evolution in the Light of the Holy Quran ... 21
   Maqbool Malik B.Sc. Final
9. The Worst of Men ... 29
   Hassan Mustun
10. Befooled ... 31
    Khaleel-ur-Rahman
11. The College Round up .. 34

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah, and Published by A.R. Junaid Hashmi
for Talim-ul-Islam College, Rabwah.

THE 'MOON' THAT IS SET

Hazrat Sahibzada Mirza Bashir Ahmad M.A.

(God be pleased with him)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE
MAGAZINE

Vol. XIII	Oct., Nov., December, 1963	No. 1

EDITORIAL

September 2, 1963 was one of the saddest days in the history of the Ahmadiyya Community. Hazrat Sahibzada Mirza Bashir Ahamd (may his soul rest in peace) left this transient world for ever to rest in the lap of Him he loved best and in whose will and pleasure he sacrificed his all. The "Moon of Prophets" as he was named by God, even before his birth, in the prophecies of his holy father, the promised Messiah, for more than half a century he illuminated the souls groping in spiritual darkness of the present wrold, before this 'Moon' set, leaving the world sad and sorrowful. كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذو الجلال والاكرام The whole Muslim world in general, and the Ahmadiyya Community in particular are indeed the poorer in his demise. But let us be content in the Creator's will and humbly pray that He grant us courage and strength to bear this irreparable loss with patience and forbearance. Let us also pray that He may enable and empower us to follow in his foot-prints and fill up the huge gap created by his death. *Amen.*

Born and brought up in the sacred surrounding of the promised

Messiah's home as he was, he had devoted his life to the service of Islam right from his childhood, and in nothing else but this service did he spend each and every second of his precious life. By nature he loved seclusion and avoided making public speaches, unless he was asked by *Syedina Hazrat Khalifatul Masih II,* his holy elder brother, to whose commands he was all obedience. He however. perfected himself in the '*Jehad* of Pen ' waged by his holy father against the enemies of Islam.

For the poor and the opressed he was an angel of love, indulgence and sympathy. Those in distress would freely go to Hazrat Mian Sahib, would frankly state their grievances and he would appease them with his sweet and soothing words of advice. He was a perpetual fountain of love and kindness to all, but he was particularly kind to students. Whenever a student went to him, Hazart Mian Sahib used to be all ears to his problems and after keenly listening to him he would make sound suggestions. In 1953, when I took admission to the college, I went to request him to pray for me. After enquiring adout my father, mother, and other relatives he said, "Mian, remember that in the college you are to learn to stand on your own footing. Don't depend any more on what is taught in classes. Your professors will only guide you and you will have to do everything by yourself. So enter the college with a determination to work hard".

When a candidate of an examination went to him, he used to instruct him in detail about how to do the paper, what sort of questions to attempt first and what afterwards. He would emphasise the improtance of revision of the paper before leaving the examination hall. And above all, he would pray and ask the student to pary before beginning the paper and afterwards.

When Hazrat Sahib decided to start a college in Qadian, he appointed a managing committee with Hazrat Mian Sahib as its chairman in which capacity he rendered so great a service to the college that to-day we are proud of claiming it as one of the best institutions of the country. Even afterwards when the college committee ceased to exist, he continued to take interest in the affairs of the college. He not only very frequently guided and advised the authorities but invariably helped the poor and the deserving students with money, books, and fees. Every year he used to invite from the heads of the institutions a list of such students

who deserved financial assistance. In this way a number of poor children got higher education and are now serving the community and the country.

On March 30, 1961 he graced the annual function of the Fazali-Umar Hostel with his presence and addressing the students in his presidential remarks he said :

> "The scope of counselling and exhortation is vast but I will confine myself to three suggestions only; two of them are moral and one religious in nature. The moral ones are hardwork and honesty. Industry and diligence contribute to man's progress more than even intelligence. And honesty is the best of the human virtues. In fact, honesty it is which differentiates man from the lower animals.
>
> The third suggestion which is religious in nature, is about prayer. Prayer is the greatest and the best means to a personal communion with Allah—the Lord and Creator of us all. Prayer has great power. He who ignores God, ignores his own being.
>
> Remember, merely to profess Islam or Ahmadiyyat means nothing. It is practice that matters. Man is deprived of divine succour if his profession and practice do not match.
>
> Your examinations are close at hand. It is your duty to take them with great application and attention. Effort and attention should not merely aim at passing the examination. The aim, instead, should be to pass with credit and distinction.
>
> Lastly, some of you belong to the Ahmadiyya Community while others do not. All are dear to our heart. All should perform the duties which are theirs as brothers, and as guests and hosts."

New Admissions

Now when the new academic session has started we welcome our young friends and earnestly request them not to forget their goals. They

should keep their odjectives before them at every second. It has often been seen that students take admission to the college with brilliant programmes and high hopes about their future. Some of them would become engineers, others would like to be doctors, still others dream of being high civil and military officers. But it is extremely sad to note that very few of them live to fulfil their cherished desires. From amongst the pre-medical group, for instance, only 10% of the students get admission in medical colleges. The rest are just bewildered about what next to do. Similar is the case with students taking up pre-engineering courses in colleges. A terribly large number of students have to face disappointment after building airy castles for two years. What, after all, is the reason? and what the remedy?

The question is not very easy to answer as it involves so many factors and needs a thorough study not only of the academic, but also of the social, economic and even political set up.

The central figure to blame for this large scale disappointment is of course, the student himself. He enters the college with a determination to work hard and get his goal. But a few days afterwards he seems to have forgotten all about it. He starts relaxing in the so called 'free' atmosphere of the college. The fear of the school master's 'rod' to make him work is no more there. Campaigning and canvassing for the Union elections is a better pastime than the monotonous home-task and the study of text books. Gradually he loses interest in studies and finds more pleasure in extra curricular activities. Tuck shop and common room consume most of his time. Games and debates are another attraction. The College Library which should provide an intellectual feast for the student, repels him. He thinks he is 'enjoying' college life. He has forgotten his determination to work hard. He has gone astray. He is building up 'character' at the cost of his career.

This briefly is the major reason of mass failures in colleges. 'God helps those who help themselves' goes the saying. The student does not help himself to achieve his ambition. What can the teacher do? But this does not acquit the teacher of his responsibility. To put the adolescent student on the right path and to continually watch him to keep him away from evils, is the duty of the teacher for which he has to work harder than the student himself. If the student for his childishness does not approach him to establish personal contact, he has to do it. He must

bring the student close to him to know his problems and difficulties, to assess the direction and pace of his progress, to watch and guide him to the proper path.

Even more than the teacher and the taught is the responsibility of the parents. Usually parents don't take proper interest in how their child is faring in his studies. The momet a parent admits his son to the college, he loses all interest in his activities. Wise parents should remain closely in touch with their child and his teachers, and should keep themselves frequently informed as to what is happening at the college.

There are so many other factors which determine the future of the student, but this triangle—the student, the teacher and the parent—is the most important and must remain complete. Therefore we request our young friends, and their parents to come as close to their teachers as possible and establish personal contacts, so that they may form a compact academic family where everyone may realize each other's problems and find out remedies.

A Key to Success

يا ايها الذين آمنوا استعينوا بالصبر والصلوة ان الله مع الصابرين

"O ye who believe, seek help with patience and prayer; surely, Allah is with the steadfast."

Important words :

صبر (patience) means : (1) to be steadfast and constant in something ; (2) to endure afflictions with fortitude and without complain or murmur ; (3) to hold fast to the Divine Law and the dictates of reason ; (4) to refrain from doing what the Divine law and reason forbid (*Mufradat*).

Commentary :

The verse contains a golden principle of success. Firstly a a man should be constant in his endeavours, never relaxing his efforts and never losing heart, at the same time avoiding what is harmful and sticking fast to all that is good. Secondly, he should pray to God for success ; for He alone is the source of all good.

The word صبر (patience) precedes the word صلوة (prayer) in the verse to emphasize the importance of observing the laws of God which are sometimes flouted in ignorance. Ordinarily a prayer can be effective only when it is accompanied by the use of all the necessary means created by God for the attainment of an object. This fact, however, does not minimize the importance of prayer, nor does it impose any limit on the omnipotence of God. If God so wills it, prayer can work wonders even where all earthly means fail.

Islam does not teach utter and blind dependence on material means. Prayer indeed is the essence of Islam. Man is neither omniscient nor omnipotent, and if he does not seek divine guidance and assistance, he can neither see all good nor can he secure it for himself.

As explained under Important Words, the word صبر also signi-

(*Continued on page 17*)

The Real Object

The real object of man's life according to the Holy Quran is a true knowledge and worship of God and a total resignation to His will so that whatever is said or done is said or done for His sake only. One thing, at least, is plain and that is that man has no choice in the matter of fixing the aim of his life. He does not enter the world or leave it as he desires. He is a creature, and the Creator who has brought him into existence and bestowed upon him higher and more excellent faculties than upon other animals, has also assigned an object to his existence. A man may not understand it or a hundred different motives may hold him back from it, but the truth is that the grand aim of man's life consists in knowing and worshipping God and living for His sake. Almighty God says in the Holy Quran :

لاتبديل لخلق الله ذلك الدين القيم

"Islam responds to and supplies the demands of human nature and God has created man after the model of Islam, i.e., He has willed it that man should devote his faculties to the love, obedience, and worship of God. It is for this reason that Almighty God has granted him faculties which are suited for Islam.

ان الدين عند الله الاسلام

"Verily the religion which gives a true knowledge of God and directs in the most excellent way to His worship is Islam." And again :

فطرت الله التى فطر الناس عليها

We may here add a few remarks upon the wonderful aptitude of the faculties of man for Islam. The external and internal endowments of human nature give us clearly to understand that the highest object of their creation is the love and worship of God. True happiness, which is generally admitted to be the goal of life, is not attainable through the diverse pursuits which men follow but only through God. Not all the joys of this world can afford relief from the gnawing grief which attends a man's last moments upon this earth. The richest millionaire, the highest official, the most successful merchant, the greatest king, or the wisest

philosopher does not possess peace of mind and departs from this world a prey to poignant regret. His heart upbraids him for his absorption in worldly cares and his conscience judges him guilty of the employment of deceit and unfair means to attain success in his worldly affairs.

Consider the question in another light. In the case of the lower animals, we see that their faculties are so ordered as to render them unable to serve a purpose higher than a particular one and they cannot go beyond a certain limit. This leads us to the conclusion that the highest limit which the faculties of a particular animal can reach is also the highest aim of its creation. A bullock, for instance, may be used to furrow the earth or draw water or for loading, but with its present faculties it can serve no higher purpose. This is, therefore, also the aim of its existence. Judging man in the same manner we find that of all faculties which nature has bestowed upon him, the highest is that which awakens him to a search after God and incites him to the noble aspiration of losing his own self in the love of God and completely submitting himself to His will. In the requirements of his physical nature the lower animals display more skill than human beings. The bee produces honey from the juice of flowers with such exquisite skill that man has failed with all his genius to achieve anything like it. The perfection of man, therefore, does not consist in these matters but in something else. It consists in the excellence of his spirituality, in his union with God.

The true object of his life in this world is, therefore, that the window of his soul should be opened towards God.

(From the Philosophy of the Teachings of Islam)

Prof. Habibullah Khan M.Sc.

A Great Soul Passes Away

Man is indeed mortal. The Holy Quran has correctly pointed out that every one who is born in this world has to face death sooner or later. This is the ultimate end of one and all, and there is no escape from it. This cycle of births and deaths has been going on from time immemorial and shall continue unceasingly to the end of days. There is nothing special or uncommon about it. But then there are births and deaths which immensely affect the destinies of nations and profoundly influence the future course of events. This is the case with all great men who play an important role in life and seem to form a conspicuous part of God's plan. Their demise creates a vacuum which can hardly be filled by others.

Monday, the second of September, was a sad day for all members of the Ahmadiyya Community. It witnessed the passing away of a great soul. Hazrat Sahibzada Mirza Bashir Ahmad Sahib, commonly spoken of as Hazrat Mian Sahib, and, in the inner circle of his family, as *Ammoo Sahib*, had been suffering from blood pressure, heart trouble and diabetes etc. for a long time. When the illness became prolonged he shifted to Lahore and was staying at 23 Race Course Road with some members of his family. It was thought that at Lahore he would get more rest and better treatment. Indeed he did receive expert medical advice and all possible aid that could be given under the circumstances. Still, unfortunately, he could not survive. The will of God was done. On the 2nd of September at 6.48. p.m. he breathed his last and quietly passed away.

انا لله و انا اليه راجعون

Despite his prolonged illness no body thought that the end would be so near. We all prayed for his long life and were hopeful about his recovery. But it seems Hazrat Mian sahib himself knew well in advance that his end was near and was well prepared for it. Without intimating

anybody else he had deposited Rs. 600/- with his office clerk and had given instruction to him as to how the money was to be spent after his death on the funeral. This clearly indicates that he had submitted cheerfully to the will of God and was looking forward to meeting Him very soon.

However, for all Ahmadies it was a great shock. The news of his death spread like wild fire and through the courtesy of Pakistan Radio, was carried to the farthest corners of the world. Every one was stunned to hear it. Every one felt grieved to the extreme. With swelling eyes, suppressed sighs and heavy hearts people assembled at the bungalow where he was staying. After offering the funeral prayers his body was carried to Rabwah at about 3 a.m.

The people of Rabwah had already been informed about the the time when the funeral procession was expected to arrive there. Men, women and children had all lined up along the road to pay him their best respects. People came pouring in from all over the province by trains, cars or buses. Some of them came rushing in aeroplanes from long distances. About twenty thousand people participated in the funeral. His body was laid to rest at about 6.30 p.m. in the special graveyard known as *"Bihishti Maqbarah"*. May God shower choicest blessings upon his soul and may he rest in peace. *Ameen.*

Hazrat Mian Sahib was the second son of *Hazrat Ummul-Momineen* (Peace of God be upon her). He was born on 20th April 1893. God had informed the Promised Messiah (May peace & blessings of God be upon him) about his birth beforehand and had conveyed to him the glad tidings in the revelation :

ياتى قمرالانبياء و امرك يتأتى - يسر الله وجهك و ينير برهانك - سيولدلك الولد ويدنى منك الفضل - ان نورى قريب -

"The moon of prophets shall come to you and your work shall become easier. Allah shall make you happy and the truth of your mission shall be made manifest. A son shall be born to you very shortly and God's grace shall be brought closer. Verily, My light is very near."

He was married in May 1906 and has left behind him five sons and four daughters. One of his sons, Sahibzada Mirza Majeed Ahmad, was a member of our college staff for some time and

is at present Principal, Ahmadiyya Secondary School, Ghana.

Hazrat Mian Sahib was a great scholar. He wrote numerous books and pamphlets and has left a great heritage behind him. He had great insight in the teachings of the Holy Quran and was thoroughly conversant with *Hadees* (Traditions), *'Fiqah'* and the Islamic History. He was gifted with a forceful style that was peculiar to himself. Coming from the depths of his heart his words carried weight and conviction and made matters crystal clear. His book *"Seerat Khatamun-Nabiyyeen"* (سیرۃ خاتم النبیین) is an excellent exposition of the life of the Holy Prophet (May peace and blessings of God be upon him). It is a rare piece of history and is unparalleled in authenticity, lucidness and force of argument. All allegations against Islam and its Holy Founder have been singularly refuted and the excellence of Quranic teachings clearly brought out.

Hazrat Mian Sahib combind in himself so many rare qualities that he was virtually a bunch of excellences. Stately in from and dignified in appearance he wore a smile on his face. Despite his multifarious duties he was always approachable and available, both in his office and at home. There was a constant flow of visitors at all odd hours. They included relatives, friends, associates and strangers - men, women and children of all ages, climes, ranks and profession. They came to seek his advice, his prayers, his guidance and his help. They consulted him in matters public and private, great and small.

He received them all with a warm heart and a smiling face, conversed with them like father or friend and sent them back satisfied, cheerful and happy.

He was a father to the orphans, a benefactor to the needy and a solace to the care-worn. He loved to help people and shared their pleasures and sorrows. To him the poor and the rich were all alike and they all flocked to him to receive his blessings. He encouraged the young, enlightened the aged, cheered the unhappy and lifted the downtrodden. With all his piety, dignity, knowledge and wisdom he was extremely courteous, humble and unassuming and scrupulously avoided taking any place of distinction. He never led prayers or presided over meetings unless it was absolutely essential.

Every minute of his life was dedicated to the service of Islam. He worked with the zeal of a true *'Mujahid'* and tried his level best to fulfil the mission that was chalked out for him by his Creator. No doubt he is no more among us. The relentless hand of destiny has snatched him away for ever. But he still lives. He has immortalised himself by selfless sacrifices, ceaseless effort, examplary obedience to the *Imam* and by his loveable disposition. A man of such rare excellences is ever a boon of God. He lives in our hearts and shall always live in our memory. His name and work shall ever shine in the annals of Islam and the future generations will continue to derive inspiration from his writings and speeches.

May God shower His choicest blessings upon the departed soul. *Ameen.*

اللهم صلى على محمد و آل محمد و بارك وسلم
انك حميد مجيد

PURSUIT OF KNOWLEDGE

عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه و سلم
طلب العلم فريضة على كل مسلم و مسلمة (ابن ماجة)

Narrated by Hazrat Anas bin Malik : Allah be pleased with him:
Said the Prophet of Allah (Peace and blessings of Allah be on him)
"It is the duty of very Muslim man and woman to seek knowledge." (Ibane Majah)

Explanatory Note : Since Islam is based on the certain knowlege revealed by God, in the form of the final law and advances its views with supporting force of argument, it therefore very rightly lays extreme stress on the acquisition of knowledge. This is one of the many *ahadis* by means of which the Holy Prophet (peace and blessings of Allah be on him) has enjoined on Muslims, both men and women, to acquire knowledge. He was so particular about it that according to another *hadis* he is reported to have comanded "seek knowledge even if you have to go to China for this purpose." It should be borne in mind that, owing to the conditions obtaining then, China was not only the most distant country from Arabia, but also the way to it was full of great hazards and travelling to it was beset with extreme dangers and great hardships besides entailment of extraordinary expenses. The Holy Prophet (Peace and blessings of Allah be on him) has, by singling China out by way of example, in fact underlined the value of knowledge, to impress on the faithful, the necessity of acquiring learning even in face of extreme hardships and prohibitive distances. The early Muslims accordingly, as historical evidence shows, used to travel hundreds of miles and undergo heavy expenses to hear a *hadis* of the Holy Prophet (peace and blessings of Allah be on him) from his companions. When a man, after having traversed hundreds of miles, came to Damascus from Medina, to hear from Hazrat Abu Darda (Allah be pleased with him) a tradition of the Holy Prophet (peace and blessings of Allah be on him), Abu Darda related to him that particular *hadis*

and also told him that he had heard the Holy Prophet (peace and blessings of Allah be on him) say that whoso undertook a journey for the purpose of acquiring knowledge, Allah would open up for him the way to it and at the same time open his way to paradise. In another *hadis*, the Holy Prophet (peace and blessings of Allah be on him) has observed that a learned man in comparison with a worshipping man who lacks knowledge, is like unto the full moon in comparison with a star. Another *hadis* the Holy Prophet (peace and blessings of Allah be on him) carries the statement that the "learned who are also pious constitute the greatest good of my people. In yet another *hadis* the Holy Prophet (peace and blessings of Allah be on him) has observed that the learned *Ulema* are the heirs of the Prophets. As, the Holy Quran says, true learning must be accompanied by righteousness, piety and proper deeds, otherwise it is nothing better than a load on the back of a donkey.

In short, Islam has laid extreme emphasis on pursuit of knowledge and true learning has been accorded the next place to faith. Besides, knowledge has been aptly declared limitless. Hence the instruction that the more one acquires it, the more one should seek to increase it. Even the Holy Prophet (peace and blessings of Allah be on him) the Pride of creation and the Chief of the Universe and Head of the Messengers has been taught by Allah the Excellent, the following prayer in the Holy Quran. "Say : Lord grant me increase in knowlege".

As already made clear in the *hadis* under review, the Holy Prophet (peace and blessings of Allah be on him) has not restricted the pursuit of knowledge to men only He has similarly commanded womenfolk to seek knowledge. It is a matter of deep regret that, notwithstanding these peremptory injunctions, the standard of educational advancement of Muslim men and women far from being superior to that of other people, is in fact, comparatively very poor and low. Before the partition of India, the percentage of literacy among the Muslims was the lowest of all the nationalities—the Hindus, the Sikhs, the foreign Christians and the Parsees. This exhibition of illiteracy does little credit to a people who owe allegiance to the most learned of world Reformers (peace and blessings of Allah be on him). It is high time Muslims realized their

(*Continued on page 17*)

Prof. Malik Muhammad Abdullah

THE SALT OF THE EARTH

Hazrat Sahibzada Mirza Bashir Ahmad, who died on Sept 2, 1963, was one of the promised and sacred progeny of the Promised Messiah (on him be peace and blessings of Allah.) He had imbibed divine attributes and had highly polite and amiable manners. He was so pious and had such a magnetic spiritual force that whosoever met him felt a healthy change in his mind and soul which lasted for quite a long time. One distinctive feature of his character was that he was always conscious and sensitive to others' feelings and pleasure. He was so kind and sympathetic to his companions and subordinates that for their sake he neglected his own peace and comfort.

I had the honour of serving under him for about twelve years during which period I had an opportunity of experiencing his affection and generosity from very close. God had given him a heart that really shared others' pains and sufferings. As he was a man of an extremely sound and balanced opinion, there was always a host of visitors at his door to seek advice; and Hazrat Mian Sahib, inspite of his illness, would entertain and soothe everyone. In 1939 he was writing his book "*Silsila Ahmadiyya*". I was assisting him in finding references, reading proofs and in the arrangement of its printing. The month of December had already begun and Hazrat Mian Sahib wanted to publsih the book before the annual gathering which was to fall in the last week of the same month. As there was a lot of work left to be done, Hazrat Mian Sahib instructed the caligrapher to remain at his office till the book was completed. All of us including Hazrat Mian Sahib worked day and night. I used to go back home as late as 12 o'clock at night. One night after finishing work at 2 a.m., he came out of the office to go. I also accompanied him. Finding it too cold outside I told him that I would spend the night in the office as it was too late for me

to go home and it was very chilly.,

Hazrat Mian Sahib readily offered me the blanket in which he had wrapped himself. I accepted it saying that I would go down with him to his house and from there I would take the blanket. We came downstairs and reached his house from where I took the blanket, came back to the office and went to bed. A few minutes had passed when I heard a knock at the door. When I looked down through the window I was astonished to find that Hazrat Mian Sahib was standing in front of the main gate with a quilt in his hands. I ran downstairs and opened the door, whereupon he said," Malik Sahib, I thought it was too cold tonight and a banket would not be sufficient for you. So I have brought this quilt" I took it from his hands and with trembling lips said, "Sir, why did you take all this trouble?" and he said, "Malik Sahib, It does not matter. When I lay in my warm bed I realised that you needed it. The servants were all asleep and I considered it better to do it myself." He went back and I started contemplating on his kind and congenial treatment. He was so great a man and had so many people at his service that he could easily send anybody else, but he preferred to take the trouble himself rather than disturbing the servants in their sound sleep.

Once it was the month of *Ramzan*, and I was coming back home from *Darul Anwar*. When I reached near Hazrat Mian Sahib's house I heard the call for evening prayers and decided to say prayers before going home. The portion of his house for males was open. I went to the bath room, for ablution. From inside the house Hazrat Mian Sahib heard my footsteps and asked who there was. I replied that it was I, Malik Abdullah, whereupon he said, "Malik Sahib, wait and don't go after '*wuzoo*". When I came out of the bath room I saw that Hazrat Mian Sahib was himself carrying a tray containing tea and some edibles. He put it on a table in the verandah and said "I thought you might be keeping fast and it was time to break it. After taking it send the tray in. I am going for prayers."

I have related only two of the many inspiring incidents which are a precious store of my memory of the dear departed man under whom I had the opportunity to serve for several years. This loving

OUR TEACHERS ABROAD

Mr. Naseer Ahmad Khan is engaged in Research in Nuclear Physics at Durham University, U. K. for his Doctrate.

Dr. S. M. Shahid has been awarded a scholarship by the Westfield College, London where he will do Post Doctoral research in Organic Chemistry.

Mr. Zafar Ahmad Vaince has joined Christ's College, Cambridge for the degree of Ph. D. in Economics.

memory will always illuminate the soul. But alas, along with the sweet memories, a painful grief is also burning the heart. That divine angel of a man, that enlightening 'moon' is no more to be seen in this world. He was indeed, the salt of the earth, for whose existence the world was better. May God shower his choicest blessings on his soul.

(*Continued from page 6*)

fies, enduring afflictions with fortitude and without complaint and murmur. In this sense the verse would mean that the present being the time of war and bloodshed, Muslims should bear these hardships with perfect patience and fortitude and that if they did so, God would succour them in their trials.

The concluding portion of the verse i.e. Allah is with the steadfast, seems to confine itself to صبر only, excluding the element of الصلوٰة. But it is not really so, for صبر in its wider sense includes prayer also. What is meant is this, that Allah is with those who are steadfast in their endeavours as well as steadfast in their prayers. The principle provides a wonderful key to success.

(*From The Holy Quran*)

(*Continued from page 14*)

obligation and set about not only leading but outdistancing the rest of mankind in the field of both secular and religious learning.

(*From 'Forty Gems of Beauty'*)

Parvez C. Hossen

My Reminiscences

My early childhood has left an indelible impression upon my mind. The extreme hardships I endured and the sorrows which afflicted me have contributed a lot in moulding my character into a responsilble man. It was during those days of affliction that a new facet of human nature was revealed to me. And that new light which has, since then, continuously enlivened my world of darkness was nothing but love. Love, that powerful force which has united the nations of the world into one family and yet, has also driven people to desperation.

I record, so I was told, that I was born on a sultry morning of August 1942. The sage women who were present on that eventful day fortold that, being born under the sign of Leo, I was to become an outstanding figure of my family. I need say nothing here because nothing can show better than my history whether that prediction was verified or falsified by the result.

Days rolled into months and months into years until the time came when I left home, with a shining morning face, creeping like a snail, with my satchel hanging on my shoulder, for school. My father used to walk me home every afternoon. And as I walked the streets of my way home, together with him, many a citizen must have guessed, by my glowing eyes and shining face, that I was brimful with joy.

But those days of bliss did not last long. Four years after my eyes opened on this world, those of my mother were closed upon its light. My father, who by that time had taken a fancy for me, in his kindness, as best as he could, tried to dispel her sweet memories from my mind, in which attempt, I dare say, he succeeded.

Days of hardships were ahead. My father who did not hold any respectable station in life, had to toil from the small hours of morning till late in the evening. During

that long span of time, I was left to myself. After my school hours I used to roam about, trying to get company. But all in vain. I was usually kicked out by most of my neighbours like a dog. But still I was not disappointed. With a cheerful countenance I appealed to their pity hoping that one of them might accept to give me a morsel of bread and a place to sit until my father reached home.

Our house, if it could be called by that name, consisted of a single room, comprising the whole paraphernalia of a store. The lower half of the door was in such a bad condition that one could get in without unlatching it. Very often dogs stole their way inside and relished themselves on our meager provision. And many a night we had gone to bed without dinner.

As I look far back into the blank of my infancy I can still picture my small-self sitting in the dimly lighted room, listening to the frightful noises made by the rats. I can still recall those spine-chilling nights, while I sat on my bed, for we were not privileged to have a chair, I imagined the walls making faces at me. I stared back ferociously which did not seem to please them. All of a sudden a rat leapt by, and on its way it knocked down some mugs. My heart sank to the bottom of my feet and with a scream I dived into my bed sheets, perspiring profusely. After a full hour I got up again, with all my clothes wet, hopefully listening to the footfalls of my dear father. His presence was really comfortable. With his loving countenance, flashed by a broad smile, he cheered me very much. And with a lively expression of that sentiment still animating his face, he would, at each of my queries, explain to the best of his ability, my silly questions until both of us felt sleepy.

At night, clasped between his arms, I would gaze at the sky through the holes in the roof. It was a real delight to my childish mind, to be overleaned by a firmament of flaming stars and to formulate unrealisable wishes as they shot across the deep sky. It seemed to me the most delicious retreat that the imagination of man could conceive of. But, alas! those few hours of happiness slipped by and soon it was four in the morning. I could hear the rattling of my father's bicycle against the wall, though it was much against his wish. I knew then that he was leaving for his daily routine and should be back late in the evening.

My agony of mind at his leaving me was piercing. My dear father could hardly conceal his tears. I could hear his sobs which then briskly gave way to hot tears. Soon I found myself locked in his powerful arms, weeping and crying. But none of us could help it. After his departure I sat on the bed crying bitterly, but all in vain. My neighbours would not hear of leaving their nests and, instead, scolded me in the morning for having disturbed them.

A few months after, my father was taken seriously ill. At the outbreak of each new dawn I noticed that instead of recovering, dear, dear father was losing ground. His haggard eyes and wan face clearly revealed to what extent he was worried. But still he tried his best to look jovial for the sake of his son. Then one day, in all earnest, he told me he would be leaving very soon and that he had already provided for me. Though I could not understand him quite will, yet I could guess what he meant. Tears were trickling down his face, still he attempted to smile.

The twilight was by this time shading into darkness. I was in a very wretched and miserable condition. The whole place loooked forlorn and desolate. It was a very cold night, with cutting blasts of wind sweeping over the roof of our humble hut. It seemed, to my childish mind, that all the devils were let loose. I was so much frightened by the appalling night that I sought refuge in the arms of my darling father. At once I started saying my prayers but I was so much scared that I stammered and tumbled down over a few words and at last fell fast asleep.

On waking up next morning I remarked that my eyes were red and swollen. Moreover I could feel the damp about my pillow. I guessed I might have been weeping while I slept. I also remarked that my father bore lively and cheerful countenance. He had been keeping to the bed for nearly two months and, at last, the ordeal was over. He recovered gradually and prepared himself to fight the battle of life again.

Time stole on unobserved and with it a new dawn lighted upon us. With a spirit of renewed interest and a strong faith in the Almighty, my father devoted himself head and soul to his work. His efforts were crowned with success and within a lapse of a few years we rose from the slums of life to a new station. New prospect flew

(*Continued on page* 28)

Maqbool Malik B.Sc. Final

Evolution in the Light of the Holy Quran

Man has long sought to learn how, when and where life originated and the way in which the many kinds of animals and plants have come into being. Since man has started taking interest in the mysteries of nuture, several theories have been propounded to account for the origin and existence of life on earth. These theories are:

(1) *Spontaneous Creation or Abiogenesis.* In the past and even now some people believe that life originated repeatedly from non-living material by spontaneous generation. Later on an Italian physician Francesco Redi in 1668 showed that the idea is quite baseless. Living things cannot arise from non-living things.

(2) *Eternity of Present Conditions* : According to this theory every thing is created on this earth in the same form in which it exists today. Moreover these things will continue to exist as such. This theory is, also discarded because Paleontology has shown that there were many animals living in the past but now-a-days we don't find them.

(3) *Theory of Special Creation* : Tnis is the literal interpretation of the Mosaic account of creation set forth in the first chapter of Genesis—a simple beautifully described story. It is taken from the Hebrew tradition and is well suited to the state of knowledge of the time and of the people for whom it was written. Father Suarez (1548-1617), a Spanish Jesuit priest who emphasised that "the world was made in six natural days. On the first of these days the *materia prima* was made out of nothing, to receive other substantial forms; on the third day the ancestors of all living plants suddenly came into being, full grown, perfect and possessed all the properties which now distinguish them ; while on the fifth day, the ancestors of all existing animals came into being. Finally on the sixty day, the *anima rationalis* that rational and immortal substantial form which is peculiar to man, was created out of nothing and 'breathed into' a mass of matter which, till then, was mere dust of earth, and so man arose." (Huxley).

The influence of the teaching of Suarez was so profound upon European Catholic though that his teaching continued to be the only orthodox belief in Europe until the middle of the nineteenth century.

Some advocates of this theory claimed that none of the forms had changed in the several thousand years which had elapsed since the beginning.

Later on this theory was also discarded, because new research in paleontology has shown that one dominant group of animals followed the other dominant group. So there is no question of creating them in one day.

(4) *Theory of Catastrophism* : Cuvier (1769-1832) one of the founders of the science of Paleontology, as a result of his research, put forth a new theory before the world. According to this theory the catastrophisms or catachysms were world-wide and that the slaughter of the older fauna necessitated the creation of a new one to take its place.

(5) *Theory of Organic Evolution* : Under the porfound impetus of modean science all the theories described above are rejected. A new theory of organic evolution has been advanced, which means the gradual and orderly development from the simple unorganized condition of the primary matter to the complex structure of the physical universe. This may be expressed by saying that higher plants and animals, which are multicellular organism have arrived at their present state from unicellular condition, throug a process of Evolution.

Organic evolution is often imagined to be a nineteenth century contribution to biological science, but actually it itself is a product of an evolution of thought and is the sweet fruit of not fewer than twenty four centuries' labour and reseach. The Greeks, first of all, sent forward the germ of the evolutionary idea.

And now, in and after the middle ages, certain European philosophers such as Buffon, Erasmus Darwin, Charles Darwin, E. Geoffery, St. Hilaire, Lamarck and T.H. Huxley have done wonderful work on biological lines.

In this connection I will mention only Charles Darwin (1809-1882), who is beyond doubt the foremost figure in evolutionary history, because of his great intellect. He managed abundant proof in favour of his statements. His proofs are based upon thousands of careful observa-

tions extending over a long term of years. According to his point of view the creatures on this universe have originated from a common stalk. According to him the existing organisms are the modified but lineal descendants of other species that lived in former geological times. This is "descent with modfiication," the process termed as "the origin of species" by Charles Darwin. The processes of evolution are considered to be still in operation, and therefore, capable of experimental study. It is advisable to clarify a wrong point which is the product of misunderstanding of the theory of evolution postulated by Darwin. It is usually believed that according to Darwin's theory, the monkeys or apes are the ancestors of man. It is quite baseless. The fact is that man and monkey were evolved along two divergent lines from some common ancestor, and in the meantime the common ancestor disappeared from the living population of the earth. The same principle is applied to other groups of animals. Hence we cannot say that ape or monkey was the ancestor of man.

This is all about the history of evolution which I want to put in this paper. Now, I come to the Quranic theory which gives us quite a good deal of informotion about the culmination of the process of Evolution.

Origin of the Universe :

The Holy Quran says that God, who is the ultimate cause of all creation, decided to bring into existence a universe which should serve a manifestation of His Majesty and Light, and so, in order to fulfil His desire He created this universe. According to His law this universe came into being through a process of evolation.

Before the creation of heavens and earth, God ruled over waters. As He says:

و الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام و کان عرشه علی الماء لیبلوکم ایکم احسن عملا

"And He it is who created the heavens and the earth in six periods, and His Throne rests on water, that He might prove you to show which of you is best in conduct."

This verse alone shows that God has created this universe in six different periods.

How this world came into being? The Holy Quran provides us with the key to the solution of this question. The Quran says :

اولم یرالذین کفروا ان السموات و الارض کانتا رتقا ففتقنهما وجعلنا من الماء کل شیئ حی افلا یومنون—

"Do not the disbelievers see that the heavens and the earth were a closed-up mass, then We opened them out? And We made from water every living thing. Will they not then believe?" (21 : 31)

The verse supports the view that the heavens and the earth were a closed up mass, *i.e.* they were at first an amorphous mass and God then split them apart and formed it into a solar system. Moreover from the very beginning He has created life out of water.

Environments for Life:

According to the Holy Quran this universe may have passed through various stages of evolution till the earth assumed a shape and developed properties which could sustain human life. According to Quran the creation of man was the ultimate object of the creation of at least our solar system. When that stage arrived, God created the man as his representative in the world. Quran says in *Sura Nuh* :

"Have you not seen how Allah has created seven heavens in perfect harmony. And has placed the moon therein as a light and made the sun as a lamp? And Allah has caused you to grow as a good growth from the earth. Then will He cause you to return thereto, and will bring you forth a new bringing forth. And Allah has made the earth for you a wide expanse that you may traverse the open ways thereof."

How exquisitely the idea of the environments for life has been explained in the above lines! God set the solar system before the creation of man, and then made the earth worth living for him.

Where Life originated :

Scientists believe that life began in the oceans. The presence of simpler lower animals in the oceans and the presence of the sodium chloride (Nacl) and other salts in the body fluids of animals, which are also constituents of the oceans, strongly support this view. It is believed that due to the solar energy and the various inorganic salts in the water, a protein like compound was synthasised. Then again changes took place and it developed into a living substance called Protoplasm. Then this protoplasm developed into living organisms.

Quran also lays down that the the life began from water. It says :

و جعلنا من الماء كل شيئ حى-

"And we made from water every living thing (21 : 31) Again Quran says in *Sura Al-Furqan* :

و هوالذی خلق من الماء بشرا"

"And He it is who created man from water". Hence the Holy Quran strongly favours the view that life is created out of water.

Evolution of Man :

Now I come to the problem concerning the evolution of man. Before I proceed further, I consider it advisable to state that according to the Holy Quran the animals and human beings (*Homo sapiens*) have followed different lines of evolution. It is just possible that both animals and man started their life from the same living protoplasm and both directly diverged from his common primordium to different lines.

The Holy Quran says :

اولا یذکر الانسان انا خلقناه من قبل ولم یك شیئا "

"Does not man remember that We created him before, when he was naught ?" (19 : 68)

The verse tells us that God has created not only man from nothing but also other living things ? This Quranic statement favours the theory of abiogenetic creation of man and all other things, that is "the life originated from non-living matter".

In Al-Fatir, Quran says :

و الله خلقکم من تراب

"And Allah created you from dust."

And then says in *Sura Al-Sajdah*

الذی احسن کل شیئ خلقه

و بدا خلق الانسان من طین

"Who has made perfect every thing. He has created. And He began the creation of man from clay."

و لقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون

"And surely We created man from dry-ringing clay, from black mud wrought into shape" (15:27)

How clearly these verses support the scientific veiw of the creation of man. Since the cause of all creation was the creation of man, hence the origin of life described in these verses has been called as the creation of man. This also draws our attention that man has been created from حما مسنون (black mud wrought into shape). Mud becomes black when it is polluted. During pollution many gases are given out and organic matter is produced. The Holy Quran says that man is created from earth in which organic matter was present.

The fact that man has been created by passing though different stages, is stated in sura Nuh.

و قد خلقکم اطوارا

"And He has created you in different forms and different conditions."

The different stages through which man has passed in order to reach his adult form are described at another place :

و لقد خلقنا الانسان من سللة من طين ــ ثم جعلنه نطفة فى قرار مكين ــ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا المضغة عظاما فلبسونا العظم لحما، ثم انشانه خلقا اخر ، فتبرك الله احسن الخلقين

"Verily, we created man from an extract of clay ; then we placed him as a drop of sperm in a safe depository; then we fashioned the sperm into a clot ; then we fashioned the clot into a shapeless lump, then we clothed the bones with flesh, then we developed it into another creation. So blessed be All, the best of Creators."

The verse shows that man is created in six different stages. Here it should be remembered, that the creation of man was completed in two periods. The first period was that in which he was created from طين or clay, (Origin) and the second period in which he was created out of ماء مهين insignificant fluid (Evolution). God says in Quran :-

و بد اخلق الانسان من طين ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهين

"And He began the creation of man from clay. Then made his progeny from an extract of an insignificant fluid."

Again at another place God says :

"And Allah created you from dust, then from a sperm drop, then he made you pairs." (35:12)

After the creation of man from sperm and ova, he is strengthened with his physical organs, and is enriched with wisdom and mental faculties. As God says :

ثم سواه و نفخ فيه من روحه و جعل لكم السمع و الابصار والا فئدة قليلا ما تشكرون

"Then He fashioned him and breathed into him His spirit, And He has given ears, eyes, and hearts but little thanks do you give."

And at another place Quran says :

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلنه سميعا بصيرا

"We have created man from a mingled sperm drop that we might try him; so We made him hearing and seeing (75 : 3)

From the above verses it is clear that according to the Holy Quran man was created from water ; "was created" shows that it refers to the origin of life, because even now the spermatic fluid is necessary for the birth of man or any other animal. Hence here spermatic fluid is not

referred to but here the earlier conditions of earth are meant when there was water alone. Then comes the next stage in the evolution of man. "He began the creation of man from clay", some inorganic salts also appeared. Then these inorganic salts combined under favourable conditions and developed into a living material (Protoplasm). "And he has created you in different forms and conditions" refers to stages of human evolution. The main stalk which was destined to the formation of man continued to give off branches during its course through centuries and ages. Some of these branches were not able to sustain the hardships of this world. They were broken. Some of them managed to continue by adopting themselves according to the environments. "And He has given you ears, and eyes and hearts." It means that during the evoluion man has evolved thinking brain which can well utilize the informations gathered by ears and eyes. His this charachter enabled him to adjust himsef with the changing enironments, and he continued to live and evolve in a straight line, and distinguished himself from the other animals living around him. Though these animals have evolved from the same stalk but they are the aberrant forms now. They themselves have evolved, as the branches of a tree.

When the stage of the full development of man's physical as well as mental and spiritual powers had reached, God sent His vicegerent upon earth, and appointed Hazrat Adam. This was that stage of human intellect, when man became capable or forming a society and living in accordance with an organized system, and moreover became capable of receiving God's revelation. As God Himself says in *Sura Al-Araf*:

ولقد خلقناكم ثم صورناكم ثم قلنا للملئكة اسجدوا لادم

"And we did create you and then We gave you shape, then said We to the angles, 'submit to Adam' (7:12)".

The verse says that after the creation of man, God gave shape to his faculties and then commanded the angles to submit their low bow to him.

Man has surprisingly progressed in science. Different theories and Hypotheses have been advanced by the old and new scholars to explain life and its evolution. Biology can tell you how evolution has taken place? But it is not able to inform you definitely about the way in which lite originated.

Scientists may say that this universe is made of Hydrogen atoms. But the question is who has created atoms ? And you will be surprised to know that those great minds have no answer to it. We have the key to the answer of this question and that key is the verses of the Holy Quran, which says :

"He is the first and the last" (57 : 4)

This means that every thing in the universe owes its existenee to God, and every thing is brought about under His Law. He says in the Holy Quran.

"The originator of the heavens and the earth! How can He have a son when He has no consort, and when he has created every-thing and has knowledge of all things ? Such is Allah, your Lord,. There is no god but He, the Creator of all things. So worship Him. And He is Guardian over every thing." (6 : 102, 103)

(*Continued from page 20*)

wide open before us. The arena closed down upon this act. The struggle was over. We had at last succeeded in carving our way through that competitive age.

Man may go, man may come but my father will go on for ever. A noble soul, full of the milk of human kindness and sincere in his faith, he has set an example for many to come. He has proved himself, above all and in all respects, to be a worthy minister at the sacred altar of friendship. With his qualities of head and heart, his courage and implicit faith in God, he has immortalized himself.

Hassan Mustun

The Worst of Men

"The wrost of men in rank, in the sight of Allah, on the Day of Judgement will be the learned man who does not derive benefit from his learning".

Going back to the stone age or let us say in the reign of barbarism we find that there were more God-fearing people than today. Who to blame ıor this attack on our faith? We are wilful to curse the civilisation or simply fate which is thought to have already been determined. But I personally believe that everyone is master of his own fate. We are responsible for our actions and deeds and if we feel we must have a better mode of life, it's up to us to achieve it.

Bullock carts have been replaced by electric trains and fast buses. Supersonic jets are surging among the clouds at twice the speed of sound. Satellites are exploring the space and in the very near future we will be visiting the moon, not to speak of other distant planets. In other words mankind is attaining perfection in many fields of life, but nothing is being done to restore our faith in our Benefactor. Our innerself definitely feels that we are the creation of God and our gratefulness for these luxuries and facilities should go to Him. But in the eyes of the world it is becoming easier not to believe in the Creator. To believe in His existence we have got to abstain from indulging ourselves in the pleasures of this so called modern civilisation. To believe means to sacrifice, to lead a moral life, and to devote one's life to the purpose of one's existence. But I am sure dear reader, you will agree with me, nowadays such slogans fall on deaf ears. In big cities where theatres, and dancing halls outnumber places of worship, life is is too precious for sacrifice. The five pillars of Islam are to bear witness that there is no God but Allah and that Muhammad is the messenger of Allah, to observe prayer, to pay the *'Zakat'*, to

perform the pilgrimage and to fast in *Ramadan*. No doubt these are the five important laws, which if acted upon will guide us to salvation. But besides these there are equally important laws which we undeliberately fail to observe; namely honesty, regard for the poor, obedience to parents, mutual understanding with our brothers and so on. There are millions of us who say prayers five times a day and millions who pay the '*Zakat*' and fast in the month of *Ramadan*, but there are very few who derive any appreciable benefit from these.

Prayers, as laid down by the Holy Prophet (peace be upon him), gives peace of mind, helps us to tackle our problems in the light of the teachings of Islam and to acquire other good qualities for a decent life, ond accordingly is the key to heaven. But it has no meaning for those who are regular in prayers, but deliberately neglect other duties. It certainly has no meaning for those fanatics who use religion to cover their fiendish deeds. In my life I have often come across *Ulemas* or the so-called religious minded who indulge themselves in such immoral and indecent acts as adultery and lending money on high interest to the poor, some even go the extent of being adicted to alcoholic drinks and other narcotics. They are those who will be the worst in rank in the sight of God.

Once a Muslim emperor was the guest of honour at a banquet. When champagne was served, he dipped his finger in the cup, tipped off the drop, and drank the rest. When he was asked for the reoson of his strange behaviour, he replied that the Holy Prophet had said that the first drop of an alcoholic drink is poison. In spite of the fact that he knew the teachings of Islam or let us say he was a learned person, yet for the sake of society he cold bloodedly made fun of the sayings of the Holy prophet. No doubt he would say his prayers—a shield to deceive his subjects. If the same emperor had interpreted the words of this *Hadith* in its true sense and taken advantage of the occasion to preach Islam and set an example of faith and discipline, many would have followed his suit.

Khaleel-ur-Rahman

BEFOOLED

The sun was declining far in the west and the world was just on the verge of being plunged into darkness. The darkness was not only prevailing over the world but my mood was also getting gloomy along with the dusk. At last, with a heavy heart I got out of my house. I was walking — merely walking without any purpose— knowing not a bit to where or to whom to go, when suddenly I caught sight of one of my old friends and school-mates, living in an adjoining town. I was meeting him after long and was overjoyed. But I noticed a queer smile on his face mixed with a bit of satire. Suddenly he heaved a sigh with a gloomy appearance on his face. I could not get to these unaccustomed and unusual expressions from him at such an occasion Anyhow I asked him what the matter was and whether he was not pleased to see me. His answer was absolutely unexpected. He told me that although he was really very happy to see me but what shocked him was that I was so totally changed that one could hardly say with confidence that I was the same person. Anyhow he had many complaints to make against me of not visiting him for such a long time.

In school days he was a very stupid and simple fellow always with marked aloofness. Now instead of growing better he had the same peculiar everlasting innocent foolery on his face. At last the very moment an old idea poured into my mind. In school days we alwas used to befool him in such a way that he could never come to know of it, and even afterwards when he did, be never showed any sign of provocation. So I slowly and gloomily uttered, "I am leaving for America for good." He was startled and saddened as if he had received a news of someone's sad demise. His eyes looked moistened. He was on the brink of bursting into tears. Although, I had put myself into this mockery, but to face such a ridiculous reaction from him, I was not at all ready. I tried my best to put up with the burst of

laughter growing more and more within me, but since I am not a 'professional gossip' inspite of hard control, a suffocated but light laughter realeased from my lips. He was again startled and had a suspicious glance upon me. I got confused for a moment but soon I controlled the situation. I at once pointed towards a man sitting on the back of a donkey facing its tail and looking sideways in such a manner that I really laughed again. My friend, seeing the funny scene, just smiled and his doubt vanished. I had a sigh of relief.

He then talked in a very sad and sentimental manner suited to occasions of separation. And I was continuously 'killing' the laughters, agitating to be released beyond my throat.

Then after sometime he came to the point. He requested me to pay a visit to him in his hometown and spend a day with him and 'bless him with the honour' of serving me before I left for America. I thought here lay the main point. Af flrst I declined formally but when he insisted, I agreed and promised to come. Then we settled the date and time and he left me very sadly and heavy heartedly. The moment I lost sight of him behind a corner I caught hold of my belly and the compressed laughters gushed out of my throat with such an uproar that I completely lost control of myself. When this tumult subsided I wiped off the tears which were flowing down my eyes because of the continuous burst of laughter.

In short this happy incident changed my meloncholy mood and the gloom was gone. Then on the appointed date I left for his town. He received me at the bus-stop and took me to his home where he entertained me with a tasty cold drink. Then after sometime we both left his house to see the town. He took me to many worthseeing places and we visited different restaurants off and on to be refreshed for furtheir wandering. We had our lunch in a grand restaurant of the town, where my friend asked me to place an order for the things I would like to have. I availed of this opportunity to my full satisfaction. The lunch was so heavy that after it I was unable even to move from my place. My friend managed to get a taxi and we left for his home. There I had a complete rest for three hours, and in the afternoon we had tea and talked for sometime. He was

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE, RABWAH

Perspective of the New Building

looking so sad and worried that I really pitied him. But I didn't do anything to come out of this guise. I was wholly and solely absorbed within his fragrant entertainment.

Then, at length, I asked for leave. Agreeing with me remorsefully as with a severe compunction, we left for the bus-stop. There he bade me good-bye so sincerely and gloomily that I again felt a great sympathy for him and a harsh rebuke for my conscience. But again I controlled and overlooked it. He then presented me a gift as an emblem of love and friendship. And at last I thanked him from the core my heart, and assured him of the sincere feelings of our friendship and his loving memory.

And then I left him 'for ever'. From here I sent him a slip by mail with two words upon it 'Befooled—Khalil'.

THE COLLEGE ROUND UP

DEPARTURES :

We are both sad and happy to announce that two more of our prominent teachers have temporarily left us for higher studies and research abroad. Mr. Zafar Ahmad Vaince M. A. has joined Cambridge University, U.K. where he will study for the degree of Ph. D. in Economics. The proposed subject of his research there is "Economic Problems of Under-developed Countries and the impact of European Common Market on their Economies".

Dr. S.M. Shahid has gone on his second trip to the United Kingdom. He obtained his Ph. D. in Chemistry from the University of London in 1959. Now he has been awarded a scholarship for Post Doctoral Research by the Westfield College, London.

Whereas Mr. Zafar Ahmad Vaince will be away from us for two years, Dr. Shahid will be back to Rabwah in March next. Let us pray that God may enable them to achieve their goals and make them more useful for the college and the community.

Appointments.

The Principal has made the following fresh appointments for the session 1963-64 :

Mirza Anas Ahmad	: President Students' Union
Mr. Abdur Rashid Ghani	: President Hockey
Mr. Munawar S. Khalid	: President Badminton
Mr. Mohammad Aslam Sabir	: Proctor

New Society.

A new society named Social Sciences Society, consisting of students of Political Science, Civics and Economics, has been formed under the patronage of the Principal. Mr. Munawar S. Khalid will be the incharge of the Society.

Proctorial Monitors :

The following students have been appointed proctorial monitors

of their respective areas for the new session.

1. Mohammadd Akram B.A. II	*Dar-ur-Rahmat Sharqi*
2. Inamullah Qureshi B.A. II	" *Wasti*
3. Iqbal Ahmad Najam B.A. II	" *Gharbi (Mandi)*
4. Naseem Ahmad XII	" " *(Factory Area)*
5. Tahir Ahmad Mobashir B.A. II	*Dar-ul-Barakat*
6. Bashir Ahmad Khalid B.Sc. II	*Bab-ul-Abwab*
7. Mubarik Ahmad B.A. II	*Dar-us-Sadar Sharqi*
8. Nasir Ahmad "	" *Janoobi*
9. Tahir Amad Qazi XII	" *Gharbi (A)*
10. Abdul Hayee Sayal	" " *(B)*

ELECTIONS :

Almost all the societies have held their elections for the new session. The following are the office-bearers of their respective societies.

Students' Union.

Student President	: Abdur Rashid Sharif
Secretary	: Jamil Latif
Joint Secretary	: Abdushakoor Bhatti
Asstt. Secretary	: Masood Ahmad Bajwa

Science Society.

Student President	: Abdus Subhan Adil
Secretary	: Abdul Ghafoor Ehsan
Joint Secretary	: Sarfraz Ahmad Chaudhri
Representative 11th class	: S.M. Mobashir

Social Sciences Society.

Student President	: Zia ud Din
Secretary	: Syed Mohammad Ahmad
Joint Secretary	: Abdul Hamid
Assistant Secretary	: Mohammad Aaqil

Arabic Society :

President	: Mujib ud Din Ahmad B.A II
Vice President	: Kamal ud Din Ahmad B.A. II
Secretary	: Abdul Rashid Arshad B.A. I
Jt. Secretary	: Munir ul Haq Shad XII
Asstt. Secretary	: Abdul Majid Abid XI

Urdu Society :

Vice President	: Shamshad Ali Syed B.A. I
Secretary	: Mubarık Ahmad Abid XII
Jt. Secretary	: Nasir Ahmad XI

Persian Society:

President	: Khizar Hayat Bhatti B.A. II
Vice President	: Hafiz Mohammad Salim XII
Secretary	: Mohammad Nawaz Cheema B.A. I
Asstt. Secretary	: Mohammad Hayat

Psycho-Philosophical Society :

Vice Presidents	: Naeem Qudsi
	: Abdushakoor
Secretaries	: Ishaq Saqi
	: Tahir Qazi
Asstt. Secretary	: Munir Bajwa

Historical Society :

President	: Malik Mohammad Rafiq Asad
Vice President	: Mohammad Nawaz B.A. I
Secretary	: Parwaiz Aslam XII
Jt. Secretary	: Gul Mohammad XI

Majlisi Irshad :

Vice President	: Ata ul Mujib Rashid
Secretary	: Inamullah Hashmi
Asstt. Secretary	: Raziullah Khan